انتساب

والدہ محترمہ اور والد محترم کے نام

جن کی پرورش، تربیت اور دعاؤں کے طفیل میں نے ترقی کی منازل طے کیں

اور

اپنی شریک حیات کے نام

جس کے تعاون سے میں نے زندگی کا کٹھن راستہ خوش گواری سے طے کیا

فہرست

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

کچھ مصنف کے بارے میں

ہمارے محترم بھائی اور دوست قریشی صاحب جو کہ آج کل آرام کی زندگی گزار رہے ہیں، کی زندگی بہت انتھک اتار وچڑھاؤ، سنگلاخ چٹانوں اور پہاڑوں میں گذری ہے انہوں نے ملک کی ترقی اور دفاع کی مضبوطی کے لیے گراں قدر خدمات سر انجام دی ہیں ۔ قریشی صاحب نے اپنی زندگی کا تجربہ اور نچوڑ صفحہ قرطاس پر لانے کی حقیر سی کوشش کی ہے۔ جس میں ان کا مقصد اپنے نوجوانوں کا حوصلہ بڑھانے، ہمت دلانے اور اللہ سے نااُمید نہ ہونے کی ایک تعلیم ہے۔ گوکے یہ واقعات ان کی پوری خدمات کا ایک تھوڑے سے حصہ کا احاطہ کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک عظیم مقصد اور پیغام پہنچا ہے۔ اِس کو پڑھ کران کے بعد آنے والے نوجوانوں کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ یہ واقعات اسی مقصد کے لیے انہوں نے بیاں کیے ہیں کہ اگر مقصد عظیم ہو تو راستے کی کسی بھی رکاوٹ کو عبور کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

محترم قریشی صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز ایک ڈیلی ویجز کی حیثیت سے کیا وہ ایک لاہور جیسے میٹروپولیٹن شہر میں پیدا ہوا اور پیدا ہوئے۔ اپنی یونیورسٹی میں کرکٹ ٹیم کے کپتان بنے اور پھر اسی زندگی کو چھوڑ کر عملی زندگی کے لیے ڈیرہ غازی

خان کے ایک چھوٹے سے مضافاتی دیہاتی گاؤں میں آئے اور اپنی نوکری کا آغاز کیا۔

ع ’ہمت مرداں مدد خُدا‘

انہوں نے اپنی ہمت اور انتھک محنت سے دن دگنی اور رات چگنی ترقی کی اور جلد ہی اسی ادارے میں مستقل بنیادوں پر منتخب ہوئے۔ اپنی چھتیس سالہ ملازمت کے دوران انہوں نے اپنے ملک کا چپہ چپہ چھان مارا اور اس ملک کے دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنانے میں کلیدی کردادر ادا کیا۔ بقول شاعر:

وطن کی مٹی گواہ رہنا
وطن کی مٹی عظیم ہے تو
عظیم تر ہم بنا رہے ہیں

امید ہے کہ اِن کی ان کاوشوں سے بعد میں آنے والی نوجوان نسل بھرپور فائدہ اٹھائے گے۔ اور ان کے واقعات کو پڑھ کر ان کا حوصلہ اور بھی بڑھے گا اور کوئی بھی ناممکن کو ممکن بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو قبول فرمائیں۔ ان کو لمبی عمر، صحت اور ایمان کے ساتھ نصیب فرمائے۔ اور خدمت کے اس جذبے کو اس کی مغفرت کا ذریعہ بنائے۔

(آمین!)

قاضی مجیب الرحمٰن

ہوائے بہار

محترم محمد عباس قریشی اور میں پچھلے کئی سالوں سے ایک ہی سوسائٹی میں رہ رہے ہیں۔ یہ خاص شرعی زندگی گزارتے ہیں۔ پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، شرعی داڑھی رکھے ہوئے ہیں، تلاوت کرتے ہیں اور قرآن مجید کے ایک بڑے حصے کے حافظ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ سرکاری بیانیے کے مطابق محبِ وطن کہلا سکتے ہیں۔ میں شریعت کو مانتا ہوں، مگر تھوڑا سا صوفی بھی ہوں۔ اعمال میں کمزور بھی ہوں۔ اس کے باوجود شرعی لوگوں سے صلح صفائی کے ساتھ رہتا ہوں، ہاں حب الوطنی کے سرکاری بیانیے سے اختلاف رکھتا ہوں۔ میں متبادل شعور کا آدمی ہوں۔ میرے اس شعور کے باعث ان سے لڑائی ہو چلی تھی، مگر ہم دونوں شریف آدمی ہیں۔ زبانی بحث مباحثے تک رہے۔ پھر جانے کیا ہوا، یہ اپنے تجربے کے نتیجے میں میرے خیالات کے قریب آ گئے۔ اس پر میں بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔

عباس صاحب سائنس کے آدمی ہیں اور بہت خاص ادارے میں عمر گزار چکے ہیں جہاں بندہ ذرا زیادہ ہی محب وطن ہو جاتا ہے۔ میں آرٹس کا آدمی ہوں اور تعلیم کے محکمے سے ریٹائر ہوا ہوں۔ ہوں تو میں بھی محب وطن، مگر میں اُردو ادب کا اُستاد تھا، مطالعہ

پاکستان کا نہیں۔ ظاہر ہے میں مطالعہ پاکستان والا نقطۂ نظر تو رکھتا نہیں، وہی نظریہ رکھ سکتا ہوں جو ادب کا اُستاد رکھ سکتا ہے۔ اُردو ادب میں صرف علامہ اقبال ہی نہیں ہیں، میرؔ و غالبؔ بھی ہیں۔ میرؔ تو یہاں تک کہہ گئے۔ قسقہ کھینچا دیر میں بیٹھا وغیرہ وغیرہ۔ میں صوفی ہو کر بھی اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتا۔ اردو ادب میں سعادت حسن منٹو بھی ہے جس نے ٹھنڈا گوشت، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور موزیل جیسے افسانے لکھے تھے۔ اشفاق احمد نے ڈرامے لکھنے کے علاوہ ''گڈریا'' بھی لکھا تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے شہاب نامہ تو بعد میں لکھا تھا، پہلے ''یا خدا'' لکھا تھا۔ ظاہر ہے ان افسانوں کو پڑھنے والا مطالعہ پاکستان پر ایمان لانے میں تحفظات کا شکار تو ہو گا۔ یہی میرا مسئلہ ہے۔ عباس صاحب اب کتاب لکھ کر اردو ادب کی دنیا میں داخل ہوئے ہیں۔ یہ اگرچہ بازو کی گلی سے داخل ہوئے ہیں، مگر داخلہ تو ادب کی دنیا میں ہو چکا ہے۔ اب انھیں وسیع المشربی کے ساتھ ساتھ متبادل شعور کی بہت سے باتوں کو ماننا پڑے گا۔ دیکھیں یہ کتنا مانتے ہیں اور کہاں جان بچاتے ہیں۔

عباس صاحب اور میں کئی سالوں سے قریب قریب رہائش رکھے ہوئے ہیں۔ ہم ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ ہمارے بہت سے آشنا اور شناسا لوگ مشترک ہیں۔ ہمارے بعض تجربات سانجھے ہیں۔ میں ایک مدت پہلے کچھ تجربے کر چکا تھا۔ یہ ویسا ہی تجربہ یہاں آکر کر چکے ہیں۔ اب یہ سیاست میں مذہب کا تڑکا لگانے والوں کے ذکر سے کان کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ میں ایک مدت پہلے سے یہ رویہ اپنا چکا ہوں۔ بہر حال زندگی کا سفر ہے۔ ہر بندہ اپنا اپنا تجربہ اور اپنا اپنا احساس لیے پھرتا ہے۔ یہ احساسِ تفاخر ہو یا، احساس ندامت اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بہتر ہے احساسِ تفاخر جلد از جلد احساسِ ندامت بن جائے اور احساسِ ندامت کبھی احساس تفاخر نہ بنے۔ اِسی میں انسان کی نجات ہے۔

عباس صاحب نے زندگی میں بہت شاندار تجربات کیے ہیں۔ ان میں سے بعض محیر العقول ہیں۔ اس طرح کے تجربات میں میں بھی کر چکا ہوں مگر بعض تجربات کی عقلی توجیہ مل گئی تھی، بعض کی نہ مل سکی۔ کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گی۔ عباس صاحب کو بھی اپنے محیر العقول تجربات کی عقلی توجیہ کی خدا جانے تلاش ہے یا نہیں۔ اگر تلاش ہو تو بھی اچھی بات ہے اگر نہیں تو بھی کوئی حرج نہیں، آخر ہر بات کی وجہ جاننا کیا ضروری ہے۔ اس کتاب میں بعض حیران کن تجربات ہیں، جن میں حیرت ہی حیرت ہے۔ حیرت کے جہاں میں رہنے والوں کو اس جہان میں رہ کر لطف ملتا ہے۔ کبھی کبھی میرا بھی جی چاہتا ہے ایسا جہان کہیں آباد ہو جائے اور ہم لوگ اس میں آباد ہو رہیں۔

زیرِ نظر کتاب ایک اہم محکمے کے ایک اہم بندے کی سرگزشت ہے۔ اس میں ایک بندے کی بجائے بہت سے لوگوں کی کہانی ہے۔ یہ سارے لوگ اسلام اور وطن کے شیدائی ہیں۔ یہ وہ رشتہ و پیوند ہے جو ان لوگوں کو جمع رکھتا ہے۔ یہ وہ تعلق ہے جس نے انھیں ایک برادری بنا دیا ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ بانٹتے ہیں اور مل جل کر جیون کرتے ہیں۔ جینے کا یہ ڈھب اس کتاب کی سطور او رصفحات پر نظر آتا ہے۔ یہ لوگ جدوجہد کر رہے ہیں اور ایسے کمال کے ساتھ کر رہے ہیں کہ ان کا کام کارنامہ بن جاتا ہے۔ نتیجے میں ان کے دل شکر کے جذبوں سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ یہی جذبہ شکر ہے جو عباس صاحب کو اپنا ماضی یاد رہتا ہے۔ اسے یاد کرتے ہوئے دراصل وہ اپنے پالنے والے کا شکر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آج جب کئی طرف ناشکری کے الاؤ دہک رہے ہیں۔ اس میں شکر کی پھوار اور بارش ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہے جو دلوں کو سرشار کر دیتی ہے۔ ایسے میں

عزیز حامد مدنی یاد آتے ہیں جنھوں نے کہا تھا:

تازہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی
پائے جنوں سے حلقۂ گردشِ حال لے گئی

زیرِ نظر آپ بیتی میں مصنف نہ تو ضرورت سے زیادہ عاجزی کا مظاہر کرتا ہے، نہ کسی قسم کے کرب کا اظہار کرتا ہے۔ وہ سادہ اور شریف آدمی ہے، وہ شکوے کی بجائے شکر کرنے والا ہے۔ وہ تحدیث نعمت میں بخل کا اظہار نہیں کرتا، وہ حقیقت اور واقعے کی یاد آفرینی کرتا ہے، تشکیلِ جدید نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ ہمیں کتاب میں کہیں غیر ضروری عاجزی نظر آتی ہے، نہ اپنا آپ دکھانے کا جذبہ۔ وہ نہ تو خود کو کتاب سے غیر حاضر کرتا ہے، نہ ہر واقعے میں دوسروں پر چھاجانے کی کوشش کرتا ہے۔ کتاب کے اسلوب میں بھی کوئی تصنع نہیں۔ وہ خواہ مخواہ کسی ادبی اسلوب کی نقالی کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنی بول چال کی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ یہی سادگی اس کتاب کا اسلوب ہے۔ یہ سادہ بیانی اور سچائی واقعے کی بیان کے لیے بہت مفید بھی ہے، ضروری بھی مختصر یہ کہ کتاب مصنف کی تحدیث نعمت اور اظہار تشکر ہے۔ دعا ہے اللہ تعالی اس جذبۂ شکر اور اظہارِ تشکر کو قبول فرمائے اور ہم اس ملک کے ناشکری کے مارے لوگوں کو شکر کرنے کی توفیق دے۔ والسلام

۲۲/نومبر ۲۰۲۲ء

امجد علی شاکر

لاہور

پیش لفظ

پڑھائی مکمل کرنے کے بعد تقریباً ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ جلد از جلد کوئی ایسا پلیٹ فارم ملے، جہاں سے جو ڈگری حاصل کی ہے، اس کی پرکھ کے لیے کسی گاڑی میں سوار ہوا جائے اور جو کم از کم اس کی ریٹائرمنٹ تک ہر قسم کے گرم و سرد موسم میں اس کو لیے گھومتی رہے۔ بلکہ اس کے نان و نفقہ کا بندوبست بھی کرے۔ میری خوش قسمتی یہ رہی کہ گاڑی مجھے جلد ہی مل گئی، گو گاڑی برق رفتار نہیں تھی، بلکہ لوکل مسافر ٹرین تھی، لیکن چلتی رہی، چلتی رہی، اور سفر کٹتا رہا۔

تقریباً چودہ سال تک یہ گاڑی ڈسٹرکٹ ڈی جی خان اور راجن پور میں چلتی رہی اور بعد ازاں اکّیس سال تک لاہور کے اسٹیشن سے پورے ملک میں چلتی رہی۔ شمال میں خنجراب اور جنوب میں کراچی کے علاوہ مغرب کی طرف بھی رواں دواں رہی۔ راستے میں کئی جلیل القدر مسافروں کا ساتھ بھی میسر رہا جو ایک ایک کر کے اپنی منزل پاتے رہے اور خدا حافظ کہتے رہے۔ ان میں اکثر لیجنڈ تھے جنھوں نے میری ذات پر اپنے اپنے حصے کا اثر ضرور چھوڑا۔

ڈسٹرکٹ ڈی جی خان اور راجن پور میں قیام کے دوران میری فنی زندگی کی

بنیادیں استوار ہوئیں، مضبوط ہوئیں اور پھر اتنی بلندی پر پہنچ گئیں کہ قدرت نے ہر قسم کے حوادثِ زمانہ سے تقریباً محفوظ کر دیا۔ فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ تکنیک جو میں نے ڈی جی خان میں حاصل کیا، وہ شاید کہیں اور سے نہ مل سکتا۔ ڈی جی خان کے لوگ انتہائی ملنسار، میٹھے لب و لہجہ اور عمدہ اخلاق کے مالک ہیں، انتہائی عزت و احترام سے ملنے والے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈی جی خان کے قیام میں جتنی عزت حاصل کی، شاید کسی اور جگہ نہیں ملی۔

میری زندگی کا دوسرا حصہ لاہور میں اسی محکمہ اور اس سے منسلک اداروں میں گزرا جو تقریباً پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ کم و بیش پندرہ سو کلومیٹر کی لمبائی اور اوسطاً چھ سو کلومیٹر کی چوڑائی میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں نقوشِ پا نہیں چھوڑے۔ وطنِ عزیز کو بے حد خوبصورت اور لاجواب پایا۔ بہترین قوم، جس کا نام پاکستانی ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ واقعی، ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی، یہ قوم کبھی بھی، مشکل سے مشکل وقت میں نہیں گھبراتی اور ایسے ایسے کارنامے کرنے کی قابلیت رکھتی ہے کہ دوسری قومیں بمشکل ہی اس کے معیار پر اتر پائیں۔ اس سروس کے دوران میں مختلف قوموں کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا جو ایک سے بڑھ کر ایک محنتی اور جفاکش ہیں، لیکن جو ذہانت اس قوم میں دیکھی، وہ مشرقِ وسطیٰ، جنوبی ایشیاء، سنٹرل ایشیاء سمیت یورپ کے بیشتر ممالک کی اقوام میں نہیں دیکھی۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب بھی اسی قوم کے ایک فرزند کی زندگی کے اردگرد گھومتی ہے

اور میں فخریہ کہتا ہوں کہ میری فنی زندگی کا آغاز ایک ڈیلی ویجر ملازم کے طور پر ہوا اور اللہ تعالیٰ کی عنایات سے ڈائریکٹر پی اینڈ سی پر اختتام ہوا۔

بقول شاعر:

نہال اِس گلستان میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

اس کتاب میں مذکورہ واقعات زیادہ تر چشم دید ہیں اور جن واقعات میں میری غیر حاضری ہے، وہ ان لوگوں کی زبانی ہیں جو موقع پر موجود تھے۔ ان واقعات کے چشم دید گواہان میں سے اکثریت زندہ ہے اور تفصیل و تصدیق کے لیے ان سے رابطہ بھی ممکن ہے۔ پھر بھی کوئی تاریخ، دن یا واقعہ کسی وجہ سے جو کہ زیادہ تر یادداشت کے مرہونِ منت ہے، کسی صاحب کو مشکوک لگے تو اس کے لیے میں پیشگی معافی چاہتا ہوں۔ مقصد کسی کی دل آزاری نہیں، صرف اور صرف معاملات کا تذکرہ ہے جو اس زندگی میں پیش آئے۔

آخر میں جناب اظہر صاحب، جناب خان صاحب اور جناب ارشد صاحب کا شکر گزار ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور اصرار سے اپنی زندگی کے ان لمحات و واقعات کو قلم بند کرنے کی ہمت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے، آمین ثم آمین!!

والسلام و دعا گو

محمد عباس قریشی

نومبر ۲۰۲۲ء

باب اوّل

آغازِ ملازمت

ڈیرہ غازی خان کا سفر:

مؤرخہ 26 جولائی 1985ء ساون کا مہینہ اپنے جوبن پہ تھا۔ لگتا تھا، جیسے بحیرۂ عرب کے پانی سے لدے پھندے سیاہ بادل لاہور شہر کو نہ صرف اچھی طرح دھو دیں گے بلکہ دریائے راوی کی سال ہا سال سے بند پانی کی سطح آب کو پچاس سال پہلے والی پوزیشن میں لے آئیں گے۔ مسلم ٹاؤن موڑ پر 11 نمبر وین کا انتظار خطرناک حد تک بڑھ گیا اور چلتن ایکسپریس کے چھوٹنے کا وہم بھی شدت اختیار کرنے لگا تو ایک رکشہ والے کو روکا اور 25 روپے کرایہ کے طے کر کے اس میں بیٹھ گیا۔ رکشہ ڈرائیور بھی مسافروں کی کمی میں مبتلا تھا۔ بیچارا، مجھے غنیمت جان کر رکشہ میں سوار کر لیا اور جانبِ ریلوے سٹیشن روانہ ہوا۔ اچھرہ کے نزدیک پانی کا ریلا اتنا شدید تھا کہ ویسپا (رکشہ) صراطِ مستقیم پر برقرار نہ رہ سکا اور کٹی پتنگ کی طرح فیروزپور روڈ پر بے ربط ہچکولے کھاتا، کبھی اِدھر کبھی اُدھر ڈرائیور کی مہارت کا امتحان لیتا رہا۔ شادمان والا پُل

خیریت سے گزرا، لیکن مزنگ چونگی میں چوک پر ایسے لگا جیسے اچھرہ کی نہر راستہ بھٹک گئی ہے اور فیروزپور روڈ پر خاص کر مزنگ چونگی میں رواں دواں ہے۔ رکشہ پانی میں ڈبکیاں کھانے لگا اور میں کئی دفعہ غسلِ آزادانہ سے فیض یاب ہوا۔ رکشے کی آواز ایسی تھی جیسے کراچی سے منوڑہ جانے والا سٹیمر ہو۔ مسلسل ایسی آواز سے گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ ڈرا کہ خدانخواستہ رکشہ بند نہ ہو جائے اور یہاں پر تیراکی، جو کہ میں نے اچھرہ نہر میں سیکھی تھی، اس کا مظاہرہ نہ کرنا پڑ جائے۔

خدا خدا کر کے گنگا رام کا سٹاپ آیا تو بحرِ بیکراں کو کچھ سکون آیا۔ باقی کا سفر لاہور ریلوے سٹیشن تک، کبھی ڈوبے کبھی نکلے، کے مصداق مکمل ہوا۔ رکشے والے کو طے شدہ کرایہ ادا کرنے اور ٹکٹ والی کھڑکی سے سٹوڈنٹ رعایتی ٹکٹ، لاہور سے ڈیرہ غازی خان جو غالباً 20 روپے کی تھی، حاصل کی اور پلیٹ فارم نمبر 4 پر چلتن ایکسپریس کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

تقریباً سوا چھے بجے چلتن ایکسپریس کی آمد ہوئی اور میں نے ایک صاف ستھرا ڈبہ آنکھوں آنکھوں میں تولا اور اس میں ایک بہترین نشست کا انتخاب کیا جو کہ کھڑکی کے ساتھ والی اکیلی نشست تھی۔ میں نے سامان، جس میں ایک کپڑوں والا بیگ، فیلڈ میں استعمال ہونے والی اشیاء اور چند کتابیں (بشمول Mr.Billing کی Structural Geology اور Sedimentology) تھیں، سامان کے لیے مخصوص جگہ پر احتیاط سے رکھ دیا اور اپنی نشست پر براجمان ہو گیا۔

میں نے حواس درست ہونے کے بعد ارد گرد کا جائزہ لیا تو خوش نما حیرت اس

بات پر ہوئی کہ اِکا دُکا سواریوں کے علاوہ باقی ڈبہ خالی تھا۔ گارڈ کی سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی ریل گاڑی چلنے لگی اور آناً فاناً تیز رفتاری اختیار کر لی۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ برسوں کی جمی مٹی اور مستقل قیام پذیر کوڑا کرکٹ اُڑنے لگا تو فوراً کھڑکی بند کی اور یکدم خاموشی چھا گئی۔ ریل گاڑی کی تیز رفتاری کوٹ رادھا کشن جا کر بے پناہ چیخوں میں بدل گئی جو کہ ریل گاڑی کے پہیوں اور پٹڑیوں کے درمیان رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ بریک لگنے کا عمل پورا ہوا تو ایک حد تک اطمینان ہوا کہ بالآخر ان گنت سٹاپوں میں سے ایک سٹاپ تو گزرا۔ شور شرابہ شروع ہوا۔ دھکم پیل کرتے مسافر، بڑے بڑے ڈبے، لوہے اور پیتل کے دودھ والے مٹکے، کچھ میلے کچیلے، کچھ اُجلے اُجلے، ڈھکنے چین کے ساتھ ان کی گردنوں کے گرداگرد بندھے، بے ربط موسیقی جو کانوں پر بھاری ہو، ساتھ بے ہنگم شور و غوغا۔ ڈبہ جو شروع میں سکون کا احساس دلاتا تھا، وہی مچھلی منڈی کا منظر پیش کرنے لگا۔ خالی ڈبہ منٹوں میں انسانوں اور ان کی متاع سے بھر گیا۔ وہ تو شکر ہوا کہ شروع میں ہی کھڑکی کے ساتھ والی نشست مل گئی تھی ورنہ بیٹھنا محال ہو جاتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ریل گاڑی چلی تو ہر چیز مطمئن ہو گئی۔ ریلوے لائن چونکہ یہاں سے خانیوال جنکشن تک خصوصی معیار کی ہے، اس لیے سفر خاصا آرام دہ اور بغیر کسی شور شرابے کے، بلکہ سُبک روی کے ساتھ طے ہونا شروع ہوا۔ مسافروں جہاں کی کہیں جگہ ملی آرام کے ساتھ محوِ سفر ہوئے۔ ایک خاص قسم کی دل کو بھانے والی آسودگی محسوس ہوتی تھی اور ذہن بغیر کسی تردد کے دو تین دن پیچھے چلا گیا اور فلم کی طرح احساس کے پردے میں وہ تمام

باتیں جو اس سفر کی وجہ بنیں، ایک ایک کر کے بالکل واضح صورت کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آنے لگیں۔

یہ غالباً 24 یا 25 جولائی کا دن تھا جب MSc کا نتیجہ آئے صرف ایک ماہ ہوا تھا۔ میں اور نبیل امان مرزا (جیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں) ٹیبل ٹینس کھیل رہے تھے کہ ایک چپڑاسی آیا اور پروفیسر شفیق صاحب (ہمارے جیالوجی کے پروفیسر) کا پیغام پہنچایا کہ وہ آپ دونوں کو اپنے دفتر میں یاد کر رہے ہیں۔ امتحان سے باعزت پاس ہوئے تھے اس لیے اس ناگہانی بلاوے سے کوئی پریشانی نہ ہوئی اور ہم پروفیسر صاحب کے دفتر پہنچ گئے۔ السلام علیکم، وعلیکم السلام کے بعد کمرے کا جائزہ لیا تو احساس ہوا پروفیسر صاحب کے علاوہ بھی ایک شخصیت تشریف فرما ہے۔ سانولی رنگت، داڑھی مونچھ اچھی طرح صاف، موٹے شیشوں والا چشمہ، سفید شرٹ اور ہلکی سلیٹی پینٹ میں ملبوس۔ "یہ جناب رانا صاحب ہیں۔ جیوسائنٹسٹ اور ڈیرہ غازی خان کے شمالی مغربی پہاڑوں میں کام کر رہے ہیں۔" پروفیسر صاحب کی آوازِ بلند نے سرسری مشاہدہ کے سکوت کو توڑتے ہوئے اس شخصیت کا تعارف کروایا تو کافی حد تک اندازہ ہو گیا کہ ہمیں کیوں طلب کیا گیا ہے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پروفیسر شفیق صاحب گویا ہوئے کہ 'رانا صاحب برائے معدنیات ڈیرہ غازی خان کے نزدیک زیر زمین کھدائی کرنے والے ایک ادارے میں منیجر ہیں اور انکو دو عدد تازہ بہ تازہ ایم ایس سی جیالوجی (Fresh MSc Geology) چاہییں جو اس کام میں ان کی معاونت کر سکیں۔ باقی باتیں جناب رانا

صاحب خود بیان کریں گے۔'

رانا صاحب پروفیسر صاحب کے جملہ مکمل ہونے کے بعد اردو میں مخاطب ہوئے کہ 'بھائی ہم لوگ ڈیرہ غازی خان سے مغرب کی جانب سخی سرور-کوئٹہ روڈ پر تقریباً 65 کلومیٹر کی دُوری پر ایک جگہ میں ٹینٹ لگا کر بیٹھے ہیں اور اس کے نزدیک ہی ایکسپلوریشن کر رہے ہیں۔ فی الحال ہمیں دو فریش ایم ایس سی جیالوجی چاہییں جو ہمارے ساتھ نقشہ جات پر اور فیلڈ کے دوسرے امور میں کام کر سکیں۔ روزینہ 52 روپے اور عہدہ پرنسپل جیالوجیکل اسسٹنٹ کا ہو گا۔ چھٹی کم کم ملے گی اور مستقل آفیسر بننے کا کوئی وعدہ نہیں ہو گا یعنی کام بطور ڈیلی ویجر کے ہو گا۔ جب چاہیں نکال دیا جائے گا اور کسی قسم کی کوئی جاب سیکیورٹی بھی نہیں۔ علاوہ ازیں آفیسرز میس میں داخلہ منع ہو گا۔ سٹاف میس میں شرکت اور انھی کے ساتھ رہنا ہو گا۔ سٹاف میں ڈرلرز، سرویئرز اور دوسرے ٹیکنیشن لوگ شامل ہوں گے۔

اتنی زیادہ سختی والی شرائط سُنیں اور وہ بھی لاہور سے 450 کلومیٹر دُور اُجاڑ جنگل میں کرنے والی نوکری۔ خیال فوراً ملتان میں چھوڑی ہوئی یونائیٹڈ ڈسٹری بیوٹرز کی چھ ہزار والی نوکری کی طرف چلا گیا جو والد صاحب نے صرف اس لیے نہیں کرنے دی کہ وہ نوکری حاصل کردہ ڈگری سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ بہر حال جب 52 روپے روزانہ کو 30 کے ساتھ ضرب دی تو حاصل تقریباً 1500 روپے ماہانہ نکلا۔ کچھ توقف کے بعد ممکنہ ٹرانسپورٹ اور تاریخ حاضری کے بارے میں معلوم کیا تو سب سے بہتر ذریعہ ٹرانسپورٹ چلتن ایکسپریس ٹھہری۔ اس ڈیلی ویج نوکری کی قبولیت کی صورت

میں فوراً ایک یا دو دن بعد محکمہ میں رپورٹ کرنا قرار پایا۔ گھر آ کر والد صاحب سے ذکر کیا کہ ملتان کی 6 ہزار والی نوکری سے بھی 100 کلو میٹر مزید آگے اور وہ بھی 1500 روپے ماہوار پر نوکری مل رہی ہے، جیالوجی کی۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟' فوراً گویا ہوئے، 'یہ نوکری کر لو، بہت بہتر ہے۔' لاکھ حیلے بہانے کیے کہ معاوضہ تھوڑا ہے۔ جنگل اور پہاڑ کی نوکری ہے، دوری بہت ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن والد صاحب نے حکم جاری کر دیا کہ یہی نوکری کرو، اللہ اس میں برکت ڈالے گا۔

قصہ مختصر سفر کا ارادہ کیا۔ سامانِ سفر بھی باندھ لیا اور 26 جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ میں اور نبیل امان مرزا دونوں نے طے کیا کہ چلتن ایکسپریس شام کو روانہ ہوتی ہے، اس لیے ہم دونوں لاہور ریلوے سٹیشن پر ملیں گے اور اکٹھے سفر کریں گے۔ نبیل امان مرزا تو نہ آئے، شاید نوکری کی شرائط اور ماہانہ آمدنی کے ساتھ ذہنی طور پر متفق نہ ہوئے لیکن میں ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ اسی سوچ میں تھا کہ یکا یک بریکیں لگنے کی چیخوں کی آواز بلند ہونے لگی۔ خیالات کا بہاؤ بالکل رُک گیا۔ تمام تصاویر ذہن سے محو ہو گئیں اور ساتھ ہی "تازہ گرم گرم نان پکوڑے، سموسے، حلوہ، غرضیکہ جو بھی سٹیشن میں بکتا ہے، ہاکر حضرات تمام مسافروں کو دعوت دے رہے تھے، لیکن یہ دعوت نقد کھانے کی صورت میں تھی۔ اب خانیوال آ گیا اور ساتھ ہی ہم بھی نشست کو چھوڑ کر باہر کی طرف لپکے کہ کوئی پیٹ پوجا کر سکیں۔ سٹیشن پر گاری کوئی بیس پچیس منٹ رُکی اور تمام معاملات طے ہونے کے بعد عازمِ سفر ہوئی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے اور تمام مسافروں کی اٹھک بیٹھک کے بعد گاڑی نیم خماری کی

کیفیت میں ملتان کی طرف رواں دواں ہوئی۔ نیند کی کیفیت طاری ہونا شروع ہوئی۔ پھر یوں ہوا کہ کب ملتان آیا اور کب مظفر گڑھ، کچھ پتا نہ چلا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب رات کے غالباً 2 بج رہے تھے اور میٹھی سریلی خالص سرائیکی زبان سننے کو مل رہی تھی۔ یہاں سٹاپ صرف پانچ منٹ کا ہے، اس لیے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور دوسرے مسافروں کے ساتھ باہر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ خوش قسمتی سے اطہر خان جنرلزم والے موجود تھے (بعد میں ذوالفقار کھوسہ کے سیکریٹری بنے) ان کے ساتھ فون پر بات ہو چکی تھی۔ ماشاء اللہ عین وقت پر مجھے لینے کے لیے سٹیشن تشریف لائے اور ہنڈا 125 پر بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ رات پُرسکون گزری اور صبح سویرے نماز پڑھ کر بہترین مکھّن، لسّی، انڈے، پراٹھے کا ناشتہ تناول کیا اور یوں لاہور سے ڈیرہ غازی خان تک کا سفر بخیر و خوبی تمام ہوا۔

صبح 8 بجے اطہر خان صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی کی ڈیوٹی لگائی کہ مہمان یعنی مجھے محکمہ کے کیمپ میں چھوڑ آئے۔ انھوں نے پھر وہی ہنڈا 125 نکالی اور میں اپنے سفری سامان کو اپنے ساتھ چمٹا کر پیچھے والی نشست پر بیٹھ گیا اور سفر بہ جانب کیمپ شروع ہو گیا۔

ڈیرہ غازی خان کے مغربی پہاڑی علاقہ جات میں محکمہ کے کیمپ کی طرف:

یہ پہلا موقع تھا کہ مَیں ڈیرہ غازی خان شہر میں اپنے آپ کو اور شہر مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایک اجنبی سی کیفیت طاری تھی۔ دیواریں زیادہ تر بغیر پلاسٹر کے تھیں۔ اینٹوں

کا رنگ زیادہ تر پیلا اور بھورا تھا۔ گلیاں چوڑی تھیں لیکن نکاسیِ آب کی نالیاں اور ان میں پڑا ہوا گلا سڑا پانی ساری فضا کو ایک خاص قسم کی بدبو سے نواز رہا تھا۔ غرضیکہ لاہور جیسے پُر فضا، سبزے سے بھرپور اور پھولوں کی مہک والے شہر کو چھوڑ کر ایک ہی دن میں ڈیرہ غازی خان جیسے شہر میں، جو اس زمانے میں دُور افتادہ علاقہ سمجھا جاتا تھا، آنا عجیب لگا۔ مختلف آب و ہوا، موسم، کسی حد تک مختلف لوگ، حیرانی اور دلچسپی کا ہونا تو لازم تھا۔

شہر کو چھوڑ کر ڈاٹ پُل سے سخی سرور-کوئٹہ روڈ کی طرف رُخ ہوا تو دائیں بائیں ٹرکوں کی قطاریں دیکھ کر محسوس ہوا کہ اب راکھی گارج کا سفر شروع ہو گیا ہے۔ ریلوے لائن عبور کرنے کے بعد بائیں ہاتھ ہی ہائی وے والوں کی رہائشی کالونی ہے، اسے دیکھ کر کچھ اپنائیت محسوس ہوئی لیکن جلد ہی نہر والا پُل آگیا اور تمام شہری معمولات خالصتاً دیہی ماحول میں تبدیل ہو گئے۔

یہاں سے بیس پچیس کلومیٹر کے بعد قصبہ سخی سرور شروع ہوتا ہے اور درمیان میں بالکل ویران، اجاڑ اور سنسان سڑک اور اس کے دونوں جانب کا علاقہ آنے والے وقت کی سختی اور امتحانات کی پیشگوئی کر رہا ہے۔ سڑک بھی کوئی اتنی بارونق نہیں۔ اِکا دُکا ٹرک یا 'شو' والی بسیں ضرور نظر آئیں ورنہ پورا راستہ ہنڈا 125 پر خاموشی سے گزرا۔ سخی سرور میں کچھ دیر رُکے، شہر کے اندر نہ جا سکے، روڈ سے ہی نظارہ کیا اور اپنے سفر میں رواں دواں رہے۔ جوں جوں فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا، توں توں بلندی بڑھتی جا رہی تھی۔ موسمی ندی نالے بشمول سخی سرور ندی، برابر آ رہے تھے۔

مِٹھاون نالہ، دینور نالہ، سب ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ سڑک کی حالت بھی کافی پتلی تھی اور کوئٹہ سے آنے والے ٹرک راستہ چھوڑنے کے عادی نہیں لگتے تھے، اس لیے دشوار راستہ شروع ہو چکا تھا۔ ویسے بھی موٹر سائیکل پر ایسے راستے طے کرنا کافی مشکل ہے۔

خیر خدا خدا کر کے راکھی منہ والی پوسٹ آئی۔ یہاں پر کھجوروں کے درخت دیکھ کر کافی پاکیزگی کا خیال آیا۔ اب چونکہ راستہ دشوار اور سطحِ زمین کی بلندی بڑھ رہی تھی، اس لیے موٹر سائیکل بھی اپنا احتجاج ریکارڈ کروا رہی تھی۔ سڑک اب سانپ کی طرح بل کھانا شروع کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بلندی کو بھی سر کیا جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں جب رُخ مغرب کی سمت ہوتا تو سلیمان رینج اپنے پورے جوبن اور طمطراق کے ساتھ نظر آتی، جیسے بے دردی کے ساتھ اور دانت پیس کر کہہ رہی ہو 'اچھا تو آ گئے ہو جو مجھے پڑھا ہے، تو آؤ پھر دو دو ہاتھ کریں۔' سلیمان رینج سے گھبرا کر اپنی نظریں اِدھر اُدھر لگائیں تو کالے کلوٹے، بڑے چھوٹے، گول ترچھے پتھر (Boulders) دانت نکالے گھُوریاں ڈالے نظر آئے۔ یوں محسوس ہوا کہ وہ کہہ رہے ہیں 'اب آئے ہو نہ اصلی جگہ۔ اب تمھیں بتائیں گے ہمارا شجرہ نسب پڑھنے کا مزا۔'

اس معرکتہ آرا سفر کا خاتمہ سڑک کے دائیں جانب ایک بورڈ نے کیا جو ڈھکے چھُپے لفظوں میں بتا رہا تھا کہ میں دائیں جانب نیچے دیکھوں۔ جب ایسا کیا تو 20 کے قریب ایک جیسے ٹینٹ ایک قطار میں نصب نظر آئے۔ یہ چونکہ نشیب میں گڑے

تھے اس لیے کچی سڑک سے بمشکل موٹر سائیکل گزرا اور شمالاً جنوباً 6 عدد پکے کمروں سے ہو کر سیمنٹ والے تھڑے کے پاس رُک گیا۔ یہ سیمنٹ کا تھڑا اور ساتھ جڑا ہوا ایک کیبن اِس کیمپ کا آفس تھا۔ دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ سارے راستے کی دھول مٹی کپڑوں اور چہرے کا میک اَپ کر چکی تھی۔ موٹر سائیکل سے اترا، سامان اسی تھڑے پر رکھا اور جتنی کوشش کر سکتا تھا، اس گرد و غبار سے اپنے کپڑوں کو نجات دلوانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران ایک بزرگ شخصیت آسمانی رنگ کے شلوار قمیض میں ملبوس شانے لٹکائے ہوئے بڑی مؤدبانہ چال میں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھے۔ محتاط ہو کر کھڑا ہو گیا اور اپنے محسن جناب اطہر خان کے بھائی کے شانہ بشانہ اس بزرگ ہستی کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔

بھاری بھر کم آواز میں "السلام علیکم" کی آواز آئی۔ ہم نے بھی میمنے کی سی آواز میں "وعلیکم السلام" کہا اور عرض کی کہ ہمیں جناب رانا صاحب نے بھیجا ہے اور دوسرا ساتھی نہیں آیا۔ فوری طور پر آفس کھلوایا گیا اور ہم دونوں آفس میں داخل ہو گئے۔ باہر ایک چپڑاسی بھی آگیا جس کو حکم دیا گیا کہ 'جاؤ چائے پانی کا انتظام کرو' اور وہ حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گیا۔

"میرا نام محمد اجمل ہے اور میں یہاں کیمپ انچارج ہوں۔" وہ بزرگ شخصیت گویا ہوئی اور اپنا تعارف کروایا۔ ایک چیز نوٹ کرنے والی تھی کہ اجمل صاحب الفاظ بہت ناپ تول کر بول رہے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ اپنا پہلا تاثر بھی اتنا بھرپور دیں کہ نووارد اگر ٹِک گئے تو ہمیشہ کے لیے مؤدب رہے، یعنی پہلے دن ہی بِلّی

کو مارنا تھا۔

شومیِ قسمت کہ تمام راستے کی تھکان، گرد و غبار میں اَٹا ہوا وجود، اس سب نے اتنا سہما دیا کہ 'ہاں جی، جی جی' کے سوا اور کوئی بات منہ سے نہ نکلی۔ چائے پانی کے بعد اطہر خان صاحب کا بھائی اجازت لے کر موٹر سائیکل پر بیٹھا اور مجھے ان دیکھے، ایک طویل سفر کے آغاز میں کیمپ چھوڑ گیا۔

دوپہر کے کھانے کے لیے آفیسرز میس میں گئے۔ یہاں کافی سکون محسوس ہوا۔ صاف ستھرا ماحول، رنگین ٹی وی کی موجودگی اور ساتھ ایئر کنڈیشنر کا نصب ہونا، 12 بندوں کی بڑی سی کھانے والی میز، فرش پر چاروں طرف قالین، تمام حالات متاثر کن، لہٰذا ذہن آہستہ آہستہ مثبت سوچ کی طرف آنا شروع ہو گیا۔ 'سوچا سارے لوازمات تو ہیں، پھر فکر کس بات کی؟' آہستہ آہستہ صیّاد اپنے دام میں آ رہا تھا۔ 'السلام علیکم' کی آواز نے ہوشیار کیا، دیکھا تو نرم طبیعت اور بھولپن لیے ایک شخصیت میس میں داخل ہوئی اور اپنا تعارف ایوب صاحب کے طور پر کروا رہی ہے۔ 'وعلیکم السلام' کے بعد تھوڑی گپ شپ ہوئی جس کا زیادہ تر محور اپنے اپنے علاقے کے تعارف سے تھا۔ ایوب صاحب فیصل آباد اور اجمل صاحب جلال پور جٹاں (گجرات) کے تھے۔ دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھایا۔ بھوک بھی لگی ہوئی تھی، عمر بھی جوانوں والی تھی، اس لیے خوب سَیر ہو کر کھانا کھایا۔ کچھ دیر میس میں قیام رہا، پھر نماز کے لیے رخصت طلب کی اور باہر نکل آیا۔ اجمل صاحب نے پیچھے سے آواز دی کہ خان صاحب چھٹی پر گئے ہوئے ہیں، اس لیے کچھ دن ان کے ٹینٹ میں رہا جا سکتا

ہے۔ شکریہ ادا کرنے کے بعد میں چپڑاسی کی رہنمائی میں خان صاحب کے ٹینٹ میں داخل ہوا۔ کچھ تازگی حاصل کرنے کے بعد چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی نیند نے آلیا اور خوب مزے لے کر سویا۔ عصر سے کچھ پہلے تقریباً چار بجے اچانک گھبراہٹ سے آنکھ کھلی۔ ایسے لگا جیسے سانس بند ہو جائے گا۔ ڈیزرٹ کولر جو چل رہا تھا، وہ بھی بند ہو گیا۔ اس کو چلانا چاہا تو ایک موٹا تازہ چوہا نما جانور (جھاڑ چوہا) نظر آیا۔ پریشانی مزید بڑھ گئی۔ سانس دھونکنی کے مانند چلنے لگا۔ پھر ایسے محسوس ہوا کہ بند ہو رہا ہے۔ ٹینٹ میں اس ابتدائی چند گھنٹوں کے قیام نے اتنا خوفناک اور ڈراؤنا تاثر چھوڑا کہ یکدم ٹینٹ سے باہر آیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ یہ پہلا جھٹکا تھا جو مجھے فیلڈ میں لگا۔ اسی کشمکش میں پیاس بھڑک اُٹھی۔ ساتھ ہی میس میں چلا آیا اور باورچی سے پانی مانگا۔ پانی پینے کے بعد جب کچھ طبیعت سنبھلی تو ذہن نے فوراً ارادہ کیا کہ بھاڑ میں جائے یہ نوکری، واپس چلا جائے اور فی الحال لاہور میں رہا جائے اور وہاں کوئی دوسرا باعزت کام ڈھونڈا جائے۔ سامنے دیکھا تو ایوب صاحب میری ہی طرف آ رہے تھے۔ شاید میری کیفیت کو بھانپ گئے تھے۔ ششدر حالت میں مصنوعی بہادری کے ساتھ ان کے پاس چلا گیا۔ ہم وہاں موجود کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ دریافت کرتے، میں بول اٹھا۔ ”محترم لاہور جانے والی بس کہاں سے ملے گی؟“ انھوں نے سڑک کی طرف دیکھا اور بولے، ”وہ جو لال رنگ کی GTS آ رہی ہے، یہ دن میں ایک بار ہی چلتی ہے۔ یہ آپ کو ڈی جی خان سے براستہ ملتان لاہور لے جائے گی۔ لیکن آج آپ نہ جائیں، کیونکہ جب تک آپ اوپر روڈ پر پہنچیں گے،

وہ بس جا چکی ہو گی۔ لہٰذا کل ہم آپ کو اوپر سڑک پر بٹھا آئیں گے تا کہ آپ بآسانی اس کو پکڑ سکیں۔"

اسی دوران نمازِ عصر کا وقت ہو گیا۔ نماز پڑھی اور ایوب صاحب کہنے لگے، "چلیں آپ کو سٹاف کیمپ دکھائیں۔" چنانچہ ہم سٹاف کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک جگہ کافی شور ہو رہا تھا۔ سٹاف کے لوگ وہاں والی بال کھیل رہے تھے۔ کھیل کا معیار کافی بہتر تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ لوگ رُک گئے اور تعارف وغیرہ سے فارغ ہو کر کھیل دوبارہ شروع کر لیا۔ وہاں سے گھوم کر ٹینٹ ایریا میں چلے گئے جہاں ان لوگوں سے ملاقات ہوئی جو بعد میں برسوں ساتھ رہے۔ ٹینٹ کے اندر کا ماحول الف لیلوی کہانیوں میں مذکور شہزادوں کے خیموں سے مختلف نہ تھا۔ بہترین صاف ستھرا ماحول، دائیں بائیں چارپائیاں، جن پر اُجلی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ دروازے کے ایک طرف ڈیزرٹ کولر اور پیچھے نہانے کے لیے متصل چھول داریاں۔ اس خیمہ بستی میں تقریباً سارے خیمے ایک ہی سائز کے تھے، 12 یا 14 مربع فیٹ۔ غرضیکہ خیمے خوبصورتی اور نفاست میں یہاں کے مکینوں کے بارے میں بھی بہت معلومات دیتے تھے۔ جس خیمے میں سب سے پہلے جانے کا اتفاق ہوا، وہ جناب علوی اور احسان صاحبان کی مشترکہ رہائش گاہ تھا۔ خیمہ کے اندر کا ماحول بے حد متاثر کن تھا۔ ان کے ساتھ والے خیمہ میں جناب عبد القیوم اور چوہدری صاحب سینئر ڈرلرز کا تھا۔ یہ بھی اپنی اندرونی صفائی ستھرائی اور قرینہ کی بدولت خوب سجا ہوا تھا۔ اب ذہن اس بات پر مائل ہونے لگا تھا کہ یار، ماحول تو کافی پُر کشش اور آرام دہ ہے۔ خیر، اب

جناب شرافت کا خیمہ آیا، پھر جناب عبد الرشید کا۔ غرضیکہ تھوڑا تھوڑا تعارف اور خیمہ بستی کا چکر کافی مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ ایک اور خیمہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو ایک مانوس سی شکل سامنے کرسی پر براجمان نظر آئی۔ سلام دعا کے بعد موصوف پوچھنے لگے، 'آپ کو کہیں دیکھا ہے۔' غور کیا تو مجھے بھی ایسا ہی لگا۔ پھر ہمارا "ڈاکخانہ مل گیا" جب انھوں نے میرے والد اور دادا مرحوم کا نام لیا۔ اب چونکنے کی باری میری تھی۔ میں پہچان گیا کہ یہ صاحب لاہور میں ہمارے گھر کے سامنے رہائش پذیر ہیں اور عرصۂ دراز سے وہاں رہائش رکھے ہوئے ہیں، لیکن چونکہ فیلڈ میں زیادہ وقت گزرتا ہے، لہٰذا باضابطہ ملاقات نہیں ہو سکی۔ 'یہ ہے جی رضا صاحب کا خیمہ،' کانوں میں ایوب صاحب کی آواز گونجی۔ اسی اثناء میں نمازِ مغرب کا وقت ہو گیا اور کیمپ کا جنریٹر چلا دیا گیا۔ پورا کیمپ روشنیوں میں نہا گیا۔ اب تو ماحول مزید خواب زدہ ہو گیا۔ ہر سُو روشنی اور جگمگاتے خیموں کا منظر دل کو مزید بھا گیا۔

نماز ادا کرنے کے بعد میں دوبارہ سٹاف میس میں چلا گیا اور وہاں پر نصب ٹیلی ویژن کا نظارہ کرنے کے بعد رضا صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ وہاں کچھ دیر گپ شپ ہوئی، جس میں عقدہ یہ کھلا کہ اکثریت یہاں پر لاہور اور فیصل آباد کے لوگوں کی ہے۔ پھر ایک اور 'کمزوری' نظر آئی کہ یہاں کرکٹ کا اعلیٰ سامان اور ایک بہترین "کلے پچ" بھی موجود ہے جس پر روزانہ شام کے وقت "ٹیپ بال" کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔

ان تمام باتوں نے میرا کچھ وقت پہلے کیا گیا مضبوط فیصلہ پاش پاش کر دیا تھا،

لہٰذا نوکری چھوڑ کر لاہور واپسی کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔ افسران اور سٹاف ممبران کی بہترین رفاقت میں کام شروع ہوا۔ صبح صبح شور شرابے میں شفٹ کے جانے کا وقت دل کو بھانے لگا۔ کیا ڈرلر اور کیا سرویئر، سب ہی دوست بن گئے۔ آفیسرز تو ویسے ہی بہت مہربان نکلے۔ سارا کیمپ نمازی، پرہیز گار، بہترین مسجد کی موجودگی۔ پورے ایک ہفتے کے بعد ایک نہایت خوبصورت پٹھان شخص سے رابطہ ہوا جو آگے چل کر 37 سال ہوئے، ابھی تک قائم ہے۔ اعلیٰ اخلاق، نرم خُو، بے حد عزت دینے والا! یہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ خان صاحب تھے۔ یہی خان صاحب بعد میں ترقی کرتے کرتے ملازمت کے اعلیٰ درجے میں پہنچے۔ غرضیکہ ان تمام عوامل نے محمد عباس قریشی ڈیلی ویجر کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور ان دیکھی مضبوط زنجیروں میں ایسا جکڑا کہ کئی سالوں تک اس جکڑ بندی سے رہائی نہ حاصل کر سکا۔

یہ تقریباً 6 یا 7 اگست 1985 کی بات تھی جب ولی محمد نے مجھے پانچ دنوں کے 258 روپے ویجز لا کر دیے اور 2 روپے کی رسیدی ٹکٹ پر دستخط لیے۔ یہ سب سے پہلی تنخواہ تھی جو میں نے وصول کی اور ایک خاص قسم کی طمانیت قلب و جاں میں سما گئی۔

وقت گزرتا رہا، تکنیکی امور کے مختلف مراحل دیکھتا سمجھتا اور ذہن نشین کرتا رہا۔ پورا ایک مہینہ اسی تربیت میں گزر گیا۔ مختلف اقسام کے برقی آلات، ان کی کارکردگی، ڈرلنگ مشین کے کام، زیرِ زمین سے برآمد Rock Cuttings بالائی زمین پر بکھری ہوئی جیالوجی، S.St، Clay، ان کو دیکھنا، خاص خاص پیمائشیں کرنا۔

ایک دلچسپ کام ہاتھ آ گیا تھا۔ رات کو آفیسرز اور سٹاف کے ساتھ سنجیدہ دفتری گفتگو اور ہنسی مذاق، تاش کھیلنا، پھر ٹی وی کو کچھ وقت دینا۔ یونہی دھیرے دھیرے وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ ستمبر 1985 کا پہلا ہفتہ آ گیا اور ایک نئے فیلڈ میں کام کرنے کے لیے تیاریاں شروع ہو گئیں۔

ڈیرہ غازی خان کے شمالی پہاڑی علاقہ جات میں

فیلڈ کیمپ بارتھی میں:

بارتھی تونسہ شہر سے 35 کلومیٹر مغرب کی طرف ایک قبائلی قصبہ ہے جہاں کے جناب عثمان بزدار صاحب (سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب) ہیں، وہاں پر سروے کا ایک پراجیکٹ کھولا گیا۔ خان صاحب کیمپ انچارج اور ان کے نائب محمد اجمل صاحب قرار پائے۔ باقی ٹیم میں کچھ عملہ تکنیک کاروں کا تھا اور ساتھ میں بحیثیت جیالوجیکل اسسٹنٹ II اس ٹیم کا حصہ تھا۔ اسی ٹیم میں کراچی سے تعلق رکھنے والے جناب زیدی بھی نہایت دلچسپ اور اپنے کام میں ماہر آدمی تھے، جن کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔

ڈی جی خان سے براستہ تونسہ ' بارتھی تک کا سفر بھی اپنی تمام دلچسپیوں اور حیران کن واقعات سے مزیّن ہے۔ ڈی جی خان سے تونسہ تک کا سفر تو نہایت آسانی کے ساتھ مکمل ہوا لیکن تونسہ سے بارتھی تک کا جو 30، 35 کلومیٹر فاصلہ ہے، اس نے سارے کَس بل نکال دیے۔ ہوا یوں کہ قافلے کو گل کئی نالہ پار کر کے سانگھڑ نالے کے اندر سے گزر کر بارتھی پہنچنا تھا جو عام حالات میں محض ڈیڑھ سے دو گھنٹے کا

سفر تھا۔ وہ اس لیے کہ پکی سڑک تو تھی ہی نہیں، کچا راستہ تھا اور ایک بس تھی، جو مقامی تھی۔ وہ اس رُوٹ پر چلتی تھی جس میں ہر قسم کی سواری بشمول مرغیاں، بکریاں اور انسان ایک ساتھ سفر کرتے تھے۔ انسانوں کے استعمال کی چیزیں بھی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ بس کے اندر اور چھت پر سواریاں ہی سواریاں، گمان ہوتا تھا جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہو۔ یہ بس نما چیز بار تھی سے تونسہ اور تونسہ سے بار تھی آنے جانے میں تقریباً چھے گھنٹے لگاتی تھی۔ جگہ جگہ سے مسافروں کو اٹھانا اور ان کا سامان بس میں لادنا، پھر منزل کی طرف روانہ ہونا، یقینی طور پر ایک مہم سے کم نہ تھا۔

تو جناب اسی بھاری بھرکم مسافر بس کے ٹائروں کے نشانات پر ہمارے قافلے نے بھی روانہ ہونا تھا لیکن شومئ قسمت، گل کئی نالہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ پُرشور ندی کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ اس کے اندر سیلابی پانی اور اس کی موجیں غصیلی غراہٹ اور تکبر کے ساتھ ہمیں یہ چیلنج دیتے گزر رہی تھیں اگر ہمت ہے تو گزر کے دکھاؤ۔ دوپہر سے شام کا وقت آ گیا لیکن گل کئی نالے میں بہتے ہوئے غضبناک پانی کا شور اور مقدار کم نہ ہوئی۔ مقامی لوگوں نے بھی خوب ڈرایا کہ اس بھرپور ندی میں گاڑی ڈالنے کی غلطی نہ کریں۔ یہ خونی نالہ کئی بھاری بھرکم بسیں تک نگل چکا ہے۔ کچھ خوف کچھ ندی کی طغیانی، ہم سب لوگ اس نالے کے کنارے بیٹھے انتظار کرتے رہے کہ کب پانی کا زور ٹوٹے اور ہم لوگ روانہ ہوں۔ اسی اثناء میں دس بارہ لوگوں کا ایک گروپ نمودار ہوا۔ ان کے ہاتھوں میں چارپائیاں اور کچھ سرہانے تھے۔ ان کے ترجمان نے بتایا کہ وہ کسی آئل ڈرلنگ کمپنی کے ملازم ہیں جو 'آفِ بند'

پر آئل کی تلاش کر رہی ہے اور انھوں نے بھی یہاں سے گزرنا ہے لیکن دو دن سے یہاں پر پھنسے ہوئے ہیں۔ اب چونکہ شام کے سائے گہرے ہو رہے ہیں اس لیے آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں۔ آپ میں سے کچھ لوگ چارپائیاں استعمال کر لیں اور کچھ گاڑی میں بیٹھ کر حالات بہتر ہونے کا انتظار کر لیں۔ پھر کیا تھا، ساری رات کبھی گاڑی کے اندر، جہاں گرمی برداشت نہیں ہوتی تھی، یا باہر چارپائیوں پر، جہاں مچھروں کا راج تھا، اُٹھک بیٹھک ہوتی رہی اور ہم اپنی قوتِ برداشت کو آزماتے رہے۔ لاہور یاد آتا رہا۔ ماں باپ کی دی ہوئی آسائشیں یاد آتی رہیں۔ بہرحال اب تو کشتیاں جل چکی تھیں۔ اس لیے زبان پر تالے تھے اور ہمت و استقامت کے ساتھ گزارا کرنا تھا۔

صبح صبح گرم چائے اور سر پھوڑنے والے رس ناشتہ میں ملے تو کسی قدر رات کا غم جاتا رہا۔ ناشتہ کیا، تازہ دم ہوئے اور گل کئی نالہ کی منت سماجت میں لگ گئے۔ خیر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے اور دوپہر کے قریب گل کئی نالہ کو ہم پر ترس آ ہی گیا۔ کچھ زور کم ہوا اور گاڑیاں پانی میں اتار دی گئیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ نیلے رنگ کی سنگل ڈور پک اَپ تھی۔ میں فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جیسے ہی اس نے گاڑی آگے بڑھائی، فرنٹ سیٹ ساری کی ساری ڈوب گئی۔ ایک لحظہ کے لیے تو لگا کہ کلمہ شریف پڑھ لیا جائے کیونکہ سامنے نالے کا گدلا پانی ایسے نظر آ رہا تھا جیسے ہم آبدوز میں سوار ہیں۔ لیکن اللہ کو بہتری مطلوب تھی، ڈرائیور کی مہارت کہ اس نے گاڑی بند نہ ہونے دی اور ایک ہی مسلسل کوشش سے گاڑی نالے سے باہر نکال لی۔

سانس میں سانس آیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ ڈوبنے والی موت سے بچایا۔ اسی طرح قافلے کی دوسری گاڑیاں بھی پار ہوئیں اور قافلہ سانگھڑ نالے میں قائم سڑک کے اوپر رواں دواں ہوا۔ لیکن ابھی نہیں، ابھی سکون دور تھا۔ ہوا یوں کہ سانگھڑ نالے میں سیلاب تو نہیں تھا لیکن اس کی باقیات چھوٹے بڑے، گول ترچھے، بھاری بھر کم پتھروں (Boulders) کی شکل میں موجود تھی۔ ابھی مقامی بس نے رُوٹ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس لیے جا بجا پتھر لڑھکے ہوئے تھے۔ گاڑیوں کا چلنا بالکل محال تھا۔ یہاں پر اجمل صاحب اور خان صاحب کو دیکھا کہ گاڑیوں کے آگے آگے چل رہے ہیں اور پتھروں کو ہٹاتے ہوئے راستہ بناتے جا رہے ہیں۔ باقی قافلے والوں کو بھی شرم محسوس ہوئی اور منظر یہ تھا پورے کا پورا قافلہ پتھروں سے اَٹی سڑک کو صاف کر رہا ہے اور پیچھے پیچھے گاڑیاں مع فیلڈ کے سامان کے آ رہی ہیں۔

قصہ مختصر مغرب کی نماز سے کچھ دیر قبل بارتھی میں قائم جانوروں کے ہسپتال میں پہنچے جہاں پر خالی کمرے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جلدی جلدی گاڑیوں سے سامان اُتارا، اپنی اپنی چارپائی حاصل کی اور جیسے تیسے ہوا ہاتھ منہ دھویا۔ باورچی نے اپنا کچا بھُنا باورچی خانہ لگایا اور کھانا بنانے میں مشغول ہو گیا ادھر ہم لوگ اپنے اپنے بستر لگانے میں مصروف ہو گئے۔ ڈیڑھ دو دن کی مشقّت تھی، تقریباً 20، 25 کلو میٹر پیدل چلے ہوئے تھے، جسم تھکاوٹ سے بھرا ہوا تھا لہٰذا چارپائی پہ گرتے ہی سو گئے۔ کتنے مچھروں نے کاٹا، کوئی حساب نہیں۔ صبح زیدی صاحب کی دی ہوئی اذان کے ساتھ آنکھ کھل گئی۔ جیسے تیسے وضو کیا اور جناب خان صاحب کی امامت میں نمازِ فجر

ادا کی۔ یہاں موسم کافی گرم تھا اور ہوا ابھی رُکی رُکی تھی۔ ذرا سورج نکلا تو مکھیوں نے حملہ کر دیا۔ کانوں میں بھنبھناہٹ اور جہاں جہاں موقع ملا کاٹنے سے دریغ نہیں کیا۔ بہر حال یہ والا سارا دن فیلڈ کیمپ کی تیاری میں مصروف رہے۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر سنبھالی، کیمپ سٹور تیار کیا اور اگلے دن فیلڈ پر جانے کے لیے کمر کَس لی۔

مختلف برقی آلات اور نقشوں کے تعارف کے بارے میں معلومات تو پہلے ہی کیمپ میں ہو گئی تھی، اور ان کا استعمال پرانے فیلڈ ایریا میں کر چکے تھے، اس لیے یہاں پر ان کے استعمال میں کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ہاں البتہ کاٹن کی چھاگلوں میں پینے کا پانی رات بھر لٹکانا اور ساری رات وہیں پڑے رہنے دینا اور صبح صبح ٹھنڈے ٹھار پانی پینے کا تجربہ زندگی میں پہلی دفعہ ہو رہا تھا جو کہ فیلڈ کی زندگی کے حیران کن مظاہر میں سے ایک تھا۔

پہلا دن فیلڈ کا تھا، بار تھی کے جنوبی ایریا میں۔ یہاں کی جیالوجی S.St اور زیادہ تر Hard Band پر مشتمل تھی۔ مختلف آلات کی مدد سے سروے کا عمل ہو رہا تھا۔ جہاں کچھ معمول سے ہٹ کر ریڈنگ آئی وہاں پر بُتی (مخصوص نشان) لگا دی جاتی اور بعد میں فیلڈ قُلی اس پر چونا لگا کے اس کی قدر درج کر دیتا۔ کام کے نئے پن اور فیلڈ میں آزادانہ گھومنے پھرنے کے عمل نے کافی محظوظ کیا۔

اب کام کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ستمبر کی گرمیاں عروج پر تھیں۔ سورج کی تمازت پہلے سے گندمی رنگ کو اور پکا کر کے سری لنکا کی شہریت کی طرف دھکیل رہی تھی۔ خان صاحب کی رہنمائی اور اجمل صاحب کا ساتھ، سخت تکلیف دہ کام کے

باوجود فیلڈ میں چٹکلے جاری و ساری رہے، وقت گزرتا گیا۔ کھانا ساتھ میں ہوتا تھا۔ دوپہر کے وقت کچھ دیر ستاتے، ظہر کی نماز پڑھتے اور پھر کام میں جُت جاتے۔ یہاں تک کہ سورج ڈھلنے کا منظر ہوتا اور عصر کی نماز تیمّم کے ساتھ ادا ہوتی۔ پینے والا چھاگلوں کا پانی تو دوپہر کے کھانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا تھا۔ بعد میں فیلڈ قلی کے پاس موجود واٹر کولر کے پانی کا استعمال ہوتا۔ لیکن جلد ہی وہ بھی ختم ہو جاتا۔ اس طرح مغرب اور عصر کے وقت بغیر پانی سے فیلڈ ورک کیا جاتا۔ قلی بہت خوش ہوتا کیونکہ اس کا اُٹھایا ہوا وزن کافی کم ہو جاتا تھا۔

پانی کی اس کمی کا سب سے زیادہ اثر اجمل صاحب پر ہوتا۔ وہ بہت مشکل میں رہتے۔ اپنی چھاگل خالی کرنے کے بعد دوسری چھاگلوں کی طرف رُخ کرتے اور بعد میں واٹر کولر پر ہلّہ بولتے۔ اجمل صاحب کی شخصیت بے حد نرالی تھی۔ کبھی بالکل بچوں کا انداز اپناتے، خوب اٹکھیلیاں کرتے، مذاق، لطیفے اور کبھی انتہائی مختلف نظر آتے۔ خان صاحب کے ساتھ تو ان کا ساتھ بالکل لنگوٹیے کی طرح تھا۔ پہلے پہل فیلڈ معاملات میں جمہور کی رائے کے سخت مخالف ہوتے لیکن آہستہ آہستہ شریف، بھلے مانس بچے کی طرح سر جھکا دیتے اور "ٹھیک ہے" کہہ کر معاملات آگے بڑھاتے۔ چونکہ نائب کیمپ انچارج تھے، اس لیے مصنوعی مخالفت کر کے اپنے ہونے کا احساس دلاتے۔

ایک دن تو اخیر ہی ہو گئی۔ پانی بالکل ختم، گرمی کا زور، سورج کی تمازت نے جسم میں رہی سہی نمی بھی خشک کر دی۔ خان صاحب ایک بہادر رہنما کی طرح چاک

و چوبند مجاہد کی طرح کھڑے تھے، لیکن ہم سب لوگ گرمی سے بد حال ہو کے پیاسے، تھکاوٹ کی خاص قسم کی خماری میں آگے بڑھے جا رہے تھے۔ پاؤں خود بخود اُٹھ رہے تھے۔ یکا یک پانی کا ایک جوہڑ نظر آیا۔ یہ مقامی لوگوں کے لیے قدرت کا انمول تحفہ ہوتا ہے اور ایسے تحفے خال خال نظر آتے ہیں۔ ان پانی کے جوہڑوں سے، جو بارش کی وجہ سے بن جاتے ہیں، انسان و حیوان یکساں فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ حیوانات تو رفع حاجت بھی یہیں فرما لیتے ہیں۔ یہیں مقامی عورتیں کپڑے دھوتی اور اپنے بچوں کو نہلاتی ہیں۔ تو جناب اجمل صاحب نے لاڈلی طبیعت کا عظیم مظاہرہ کیا اور وہیں گر پڑے۔ "میں مر رہا ہوں، مجھے پانی پلاؤ۔" مسلسل یہی ڈائیلاگ ادا کر رہے تھے ساتھ ہی زمین پر چت لیٹ گئے۔ میں فوراً گلاس لے کر جوہڑ سے بھر کر لایا اور اجمل صاحب کو پیش کیا۔ "میں یہ پانی نہیں پیوں گا، اس میں اونٹ کا پیشاب شامل ہے۔ میں مر جاؤں گا لیکن یہ پانی نہیں پیوں گا!" صورتِ حال کافی پریشان کن تھی۔ اجمل صاحب زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک جھُپ (جھونپڑی) نظر آئی۔ میں اس طرف دوڑا کہ شاید وہاں سے صاف پانی مل جائے لیکن وہاں پہنچ کر علم ہوا کہ وہ بھی اسی جوہڑ کا پانی استعمال کرتے ہیں۔ جھُپ میں کریانہ کی چیزیں بھی تھیں۔ مٹی کا تیل بھی دستیاب تھا۔ بچوں کی کتابیں، کھلونے، مختلف ادویات یعنی یہ جھُپ وہاں کا ڈیپارٹ مینٹل سٹور تھا۔ شیلف پر روح افزا شربت کی بوتل پر نظر پڑی۔ جھٹ سے ایک خیال آیا اور اجمل صاحب کو بتایا کہ جُھپ والی دکان میں بھی صاف پانی نہیں بلکہ یہ ہی گدلا جوہر کا پانی ہے لیکن ایک بات

جو حوصلہ افزا لگی ہے وہ یہ کہ اُس کے پاس روح افزا شربت کی بوتل موجود ہے جو وہ 35 روپے میں دے رہا ہے۔ اگر اِس جوہر کے پانی میں روح افزا کا شربت شامل کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ پانی میں موجود جانوروں کے پیشاب اور مینگنیوں کی بدبو کسی حد تک غائب ہو جائے اور یہ پانی پینے کے قابل ہو جائے۔ اجمل صاحب نے بظاہر اس بات سے کوئی خاص تعلق ظاہر نہیں کیا لیکن اگلے دن نہ جانے اجمل صاحب نے کہاں سے روح افزا شربت کی بوتل حاصل کی اور واپسی پر اُسی جوہر کے پانی میں حل کر کے اُس کا شربت بنا کر پیا یہ اجمل صاحب کی شخصیت کی پہلی پہلی جھلک تھی جو بعد میں باقاعدہ ایک باب کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ان شاء اللہ ان کا تذکرہ بارہا آئے گا۔ (بعد ازاں یہ روح افزا کی بوتل فیلڈ میں ساتھ رہنے لگی)

ایک دن کیا ہوا کہ میں نے اجمل صاحب کو ایک ٹافی دی۔ اسی اثناء میں خان صاحب بھی آ گئے اور انھوں نے کہا کہ 'اجمل صاحب، یار ٹافی آدھی آدھی کر لیتے ہیں کیونکہ میرا دل بھی چاہ رہا ہے ٹافی کھانے کو۔' اجمل صاحب فُل سٹینڈ بلکہ ٹنگسٹن کاربائیڈ سٹینڈ میں آ گئے اور بولے، 'نو، میں تو ٹافی آدھی نہیں کروں گا، اگر ہمت ہے تو مجھ سے چھین لو' اور ساتھ ہی ٹافی والی مُٹھی مضبوطی سے بند کر لی۔ مجیب صاحب نے بھی چیلنج قبول کر لیا۔ فُل جوانی اور طاقت میں تھے، لہٰذا اجمل صاحب کے اس ہاتھ کی طرف بڑھے جس میں ٹافی تھی، ہاتھ پکڑ لیا اور زبردست زور آزمائی شروع ہو گئی۔ طاقت اور ہمت کا نظارہ بہت مزا دے رہا تھا۔ اب باقاعدہ کُشتی شروع ہو گئی۔ دونوں نے چونکہ ہار نہ ماننا تھی اس لیے فُل گتھم گتھا سین چل رہا تھا۔ کبھی

خان صاحب اوپر تو کبھی اجمل صاحب۔ لیکن کیا مجال کہ اجمل صاحب کی مُٹھی کھلی ہو۔ ادھر خان صاحب بھی ہمت نہ ہار رہے تھے۔ کافی دیر بعد دونوں صاحبان جب تھک گئے اور سانس بے قابو ہونے لگی تو ہانپ کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ اجمل صاحب نے مُٹھی کھولی تو ساری کی ساری ٹافی پگھل کر ان کے ہاتھوں کی انگلیوں سے باہر بہنا شروع ہو گئی۔ یوں اس شاندار دنگل کا خاتمہ ہوا۔

سروے کرتے کرتے چونکہ دو تین ماہ ہونے کو تھے اور کافی علاقہ چھانا جا چکا تھا، اور اب ایک مخصوص تہہ (Bed) کی تلاش کی جا چکی تھی جس میں گوھر مقصود کو ریکارڈ کیا گیا تھا اور وہ بیڈ موہوئی سے ہوتا ہوا راندھن اور پھر تھل سر اور مزید شمال کی طرف ترنگ اور آگے ڈمبھار تک نشان زد ہو گیا تو خان صاحب نے ابتدائی سروے سے ایک سٹیج اوپر Mapping کا پروگرام بنایا۔ اس پروگرام میں میرے ساتھ ریاض سرویئر، اس کا اسسٹنٹ عابد اور ایک خانساماں 'میراں' جو کہ مقامی تھا، ان کی ایک ٹیم تیار کر دی گئی۔ اس ٹیم کا یہ کام تھا کہ ٹوٹل 36 کلومیٹر ایریا میں Host S.St اور اس کے اوپر نیچے والے Clay Bed کو Map کرنا تھا اور مختلف سٹیشنز پر فلائی کیمپ میں رہنا تھا۔ اس فلائی کیمپ کے لیے 14 مربع فیٹ کا ایک ٹینٹ، سروے کا سامان، اشیائے خورونوش اور کیمپ کا دیگر سامان دے کر ہمیں راندھن میں کیمپ کے لیے بھیج دیا گیا۔

راندھن کیمپ میں ہم لوگ روزانہ صبح سویرے ناشتہ کر کے سروے شروع کر دیتے اور دوپہر کے بعد سروے بند کر کے پیدل اپنے ٹینٹ میں پہنچ جاتے۔ کام کافی

محنت طلب تھا۔ خصوصاً جب سارا سروے پیدل ہی کرنا ہو، کہ یہاں گاڑی نہیں تھی۔ اسی سبب سے روزانہ جتنا سروے کرتے، اتنا ہی اپنے ٹینٹ سے دُور ہوتے جاتے تھے۔ تقریباً پندرہ دن کے بعد خان صاحب اور اجمل صاحب تشریف لاتے اور ہمارے لیے آٹا، چائے اور دوسری اشیائے خورونوش بہم پہنچاتے اور کام کی رفتار کا جائزہ لیتے۔ پھر ضروری ہدایات دے کر واپس بارتھی کیمپ میں چلے جاتے۔

کام کے دوران کافی دن گزر گئے اور دو تین واقعات ایسے ہوئے جو بظاہر تکلیف دہ تو نہیں لیکن غیر معمولی نوعیت کے تھے۔ مثلاً ایک رات یہ ہوا کہ ہم چاروں رات کو گہری نیند میں تھے۔ رضائیاں اوڑھے ہوئے اور لالٹین کی لَو انتہائی مدہم کیے ہوئے کہ یکایک کوئی نامعلوم ذی روح ہمارے ٹینٹ میں داخل ہوئی اور اودھم مچانا شروع کر دیا۔ آٹے کا تھیلا، سبزیاں، تیل، جو جو بھی ہمارے ٹینٹ میں تھا، ہوا میں اُڑتا اور پھر ہمارے اوپر رضائیوں پر گرتا۔ ایک عجیب ڈر سا پیدا ہو گیا۔ میں نے اونچی آواز سے کہا کہ ’اپنے منہ رضائیوں میں ڈال لیں اور رضائیوں کو بھی کس کر اپنے اردگرد لپیٹ لیں۔‘ تقریباً پانچ منٹ تک یہ طوفانی واردات ہوتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ سکون ہو گیا۔ دل کو جب ڈھارس بندھی تو رضائیوں سے باہر نکلے۔ ٹارچوں سے حالات کا جائزہ لیا اور ہر چیز کو پریشان حد تک اُجڑا ہوا پایا۔ سمجھ لیں کہ کوئی جنگلی جانور تھا یا کوئی غیر مرئی مخلوق، بہرحال ہمارا سارا باورچی خانہ اور ہمارے بستر، کپڑے سب کا خانہ خراب ہو گیا۔ خیر، اس کو بھی فیلڈ کی سوغاتوں میں سے ایک سمجھا اور ہم مزید جرأت کے ساتھ اگلے دن نمودار ہوئے۔

ایک دن تو بے حد عجیب واقعہ پیش آیا۔ معمول کے مطابق شام کے وقت سروے کے کام سے تھک ہار کر جب ہم اپنے خیمہ تک پہنچتے تو ہمارا باورچی میران جو ہمارے انتظار میں ہوتا تھا اور دور سے ہی دیکھ کر چائے پیش کرنے کی تیاریاں شروع کر دیتا اور کرسیاں بچھا دیتا تھا۔ جبکہ میں سب سے پہلے اپنی کرسی پر بیٹھتا، پانی کے ایک دو گلاس پیتا اور تھوڑی دیر سستانے کے بعد فیلڈ والے جوتے اتارتا اور لباس تبدیل کرتا۔ اس دن بھی یہی معمول تھا کہ اچانک ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی تیز رفتار شے، جو دکھائی نہ دے رہی ہو، زناٹے کی سی آواز سے میرے پاس سے گزری ہو۔ میرے جسم کے سارے رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔ لیکن حیرت والی بات یہ تھی کہ کوئی ڈر خوف محسوس نہ ہوا۔ بہر کیف میں نے اپنے واضح طور پر رونگٹھے کھڑے ہوئے محسوس کیے۔ کچھ دیر بعد اپنے معمول کے مطابق لباس تبدیل کیا، وضو کیا اور نمازِ مغرب کے لیے تیار ہو گیا۔ اگلے دن پھر یہی معاملہ پیش آیا جیسے کوئی شے زناٹے کی رفتار کے ساتھ گزری اور پھر میرے رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔ پھر اس سے اگلے دن تو یہ ہوا کہ عشاء کی نماز کے بعد ہم لوگ کھانا کھا کر حسبِ معمول چہل قدمی کر رہے تھے کہ سامنے والا درخت یکدم جل اُٹھا اور اس کے جلنے سے باقاعدہ روشنی کا ایک ہالہ نمودار ہوا۔ ہم لوگ سمجھے کہ یہ مقامی بلوچوں کا کام ہے جو بعض اوقات کسی سانپ کو قابو نہ کر سکیں تو مشکوک جھاڑی کو آگ لگا دیتے ہیں۔ صبح جب بیدار ہوئے تو ایک تجسس کی وجہ سے میں اس درخت کے پاس گیا، کہ دیکھوں تو کتنا جلا ہے۔ لیکن وہاں جلنے کا کوئی نشان نہ تھا، جھاڑیاں بھی نہ تھیں اور ایسے لگ رہا تھا جیسے یہاں

جلنے کا کوئی عمل کبھی ہوا ہی نہ ہو۔

ان واقعات کے رونما ہونے کے بعد جب جناب خان صاحب اپنے معمول کے وزٹ پر آئے اور چائے پانی کے بعد خیریت پوچھی تو میں نے ان کو یہ واقعات سنائے۔ وہ فوراً اُٹھے اور جہاں ہم نے خیمے لگائے تھے اس علاقے کا جائزہ لینے لگے۔ جب وہ خیمے کے پیچھے گئے تو تھوڑی دیر کے بعد تیز تیز قدموں سے واپس آئے، تو جیسے ان کی عادت ہے، جلدی جلدی بولے: "فوراً خیمہ اکھاڑو، جہاں تم لوگوں نے خیمہ لگایا ہے یہ جگہ اُن لوگوں (غیر مرئی مخلوق) کی ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں، پیچھے ایک پچاس فٹ چوڑی اور تقریباً ایک سو فٹ گہری دراڑ ہے، جس میں مردہ جانوروں کی ہڈیاں بھی ہیں۔ چلو میرے ساتھ میں تمھیں دکھاتا ہوں۔" چنانچہ ہم نے ان کے ساتھ جا کر دیکھا تو ویسے ہی پایا جیسے خان صاحب نے بتلایا تھا۔ پہلے تو ڈر نہیں لگ رہا تھا لیکن اب ڈر اور خوف والی کیفیت طاری ہونے لگی اور آناً فاناً خیمہ اُتار لیا گیا۔ باقی سامان بھی لپیٹا گیا اور اونٹ پر لاد کر وہاں سے برق رفتاری سے ٹھیکر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ٹھیکر بارتھی کا ایک گاؤں ہے جس کی آبادی تین چار ہزار نفوس پر مشتمل ہو گی اور خواندگی کی شرح سو فیصد ہے۔ گاؤں کے باہر ہی پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ یہ مقام راندھن سے سات کلومیٹر شمال کی طرف ہے اور اسی سیدھ میں تھل سر، ترنگ اور ڈمبھر والے علاقے ہیں۔

ایک اور بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ایسے سکون والے علاقے شہر کے شور سے

دور، جہاں رات کو آسماں پر چمکتے ستارے آپ کو بے حد آرام دہ ذہنی آسودگی فراہم کرتے ہیں، وہیں غیر مرئی مخلوق کا تصور تھوڑا ڈراتا بھی ہے۔ اسی ڈر کی وجہ سے میں اللہ تعالیٰ کے ذکر میں پناہ تلاش کرنے لگا۔ تہجد کی نماز بھی شروع کر دی۔ رات کو سردی بہت ہوتی تھی، اس لیے گرم پانی واٹر کولر میں جمع کرلیتا اور تہجد کے وقت اس سے وضو کرلیتا۔ ساتھ ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کرم کیا کہ قرآن پاک کی بڑی سورتیں مثلاً سورۃ یٰسین، سورۃ فتح، سورۃ ملک زبانی یاد ہوتی گئیں۔ وہاں اس کام کے لیے ماحول انتہائی سازگار تھا۔ اللہ کی مہربانی شاملِ حال تھی، اس لیے مجھے ان عظیم الشّان سورتوں کو یاد کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔

اسی طرح کے معمولات میں سخت محنت والے عمل اور سیکھنے کے درجات میں چار مہینے کا عرصہ گزر گیا اور ہمارے دونوں کیمپ انچارج واپس ڈی جی خان رپورٹ کرنے چلے گئے۔ اسی دوران کیمپ کی لوکیشن بھی تبدیل ہوئی اور ہم سب موہوئی کے میدان میں خیمہ زن ہو گئے۔

خان صاحب اور اجمل صاحب کے جانے کے بعد مجھے کیمپ انچارج کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے کہا گیا۔ پہلی شام ہی وہاں فائرنگ ہوئی اور ایک قتل ہو گیا۔ جن کا قتل ہوا وہ بھاگم بھاگ ہمارے کیمپ میں آ گئے اور درخواست کی کہ ہمیں آپ اپنی گاڑی دیں، تاکہ مضروب کو تونسہ کے بڑے ہسپتال لے جایا جائے۔ قریب تھا کہ میں اپنی ناتجربہ کاری کے باعث گاڑی اور ڈرائیور ان کے حوالے کر دیتا، عبدالقیوم صاحب نے منع کیا کہ سر دوسرا فریق ہماری گاڑی اور ان لواحقین پر

دوبارہ حملہ کر سکتا ہے۔ اس لیے گاڑی دینے سے اجتناب کریں!‘میں نے ویسے ہی کیا۔ یہ پہلی ٹریننگ تھی جو مجھے فیلڈ کے بارے میں ملی۔

کچھ ہی دنوں بعد حکم ہوا کہ کیمپ کو بار تھی ہسپتال کی خالی بلڈنگ میں شفٹ کر دیا جائے۔ اسی دوران ابتدائی جیولوجیکل سروے مکمل ہو گیا اور ڈی جی خان سے کھدائی والی مشین آگئی۔ یہ رِگ موہوئی میں ڈرلنگ کر رہی تھی جو کہ ایکسپلوریشن کی ابتدائی سٹیج ہے۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدل رہے تھے۔ اسی دوران جناب مرزا صاحب سینئر جیالوجسٹ (بعد میں اعلیٰ عہدے میں تعینات ہوئے، اور بہت زیادہ عرصہ تک اعلیٰ عہدہ پر کام کرتے رہے) بار تھی کے نئے کیمپ انچارج کی حیثیت سے تشریف لے آئے۔ ظفر صاحب ایک سنجیدہ طبیعت کے نفیس، کم گو اور سخت ایڈمنسٹریٹر کے طور پر اپنی ریپوٹیشن بر قرار رکھنے کی وجہ سے پہلے ہی مشہور تھے۔ اس لیے ان کے آتے ہی ہم بھی شریف آدمیوں کی طرح ہو گئے۔

سروے کا نیا ٹارگٹ تھل سر والا علاقہ ہو گیا۔ یہاں پر گوہر مقصود کی موجودگی کی نشانیاں کافی اہم تھیں، اس لیے ڈرلنگ رِگ یہاں پر شفٹ کر دی گئی لیکن بعد میں اس کے راڈ زمین کے اندر پھنس گئے تو ایک اور کھدائی کرنے والی کمپنی کے ماہرین نے ڈرلنگ کی خدمات سرانجام دیں۔

یہاں ایک دو قابلِ ذکر واقعات ایسے پیش آئے کہ ابھی تک حیرانی والی کیفیت ہے۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ میں تھل سر میں سروے کر رہا تھا اور اتنا زیادہ محو

ہو گیا تھا کہ مجھے اندازہ نہیں رہا کہ میں اپنی پوزیشن کو ذہن نشین رکھ سکوں۔ میں اپنی دُھن میں ریڈنگ لیتا ہوا شمال کی طرف لپک رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنی والدہ کی آواز آئی، ''باچھے'' (میرا گھریلو نام) آواز کا سننا ہی تھا کہ میرا ذہنی تسلسل ٹوٹ گیا اور میں عالمِ ہوش میں آکر جس طرف سے آواز آئی تھی، ادھر دیکھنے لگ گیا۔ کچھ ساعتوں کے بعد ذہن نے کام کیا تو سوچا کہ یہاں والدہ کیسے آسکتی ہیں۔ 'بیوقوف تمھیں ویسے ہی وہم ہوا ہے۔' لیکن آواز اس قدر واضح اور شفاف تھی کہ میں جیسے نیند سے جاگ گیا اور برقی آلہ بند کر دیا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر ریکارڈنگ کرنا چاہی لیکن توجہ آواز کی طرف ہی رہی۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ تھی میں جس جگہ ریڈنگ لے رہا تھا، وہ ایک تنگ سی نالی تھی جو آگے نشیب میں داخل ہو رہی تھی اور چوڑائی اختیار کر رہی تھی۔ اب میں نے برقی آلہ کا استعمال بند کر دیا اور نشیب کی طرف جانے لگا۔ وہ نشیب اب ایک ڈھلوان کی شکل میں نیچے کی طرف ہونے لگا لیکن یہ کیا، یکدم وہ ڈھلوان 90 درجہ زاویہ میں سیدھی ہو گئی اور سامنے سوری ندی (اس علاقے کی ایک بڑی ندی) کا ریتلا بیڈ نظر آنے لگا۔ یعنی ایک فری فال جو سیدھی 250 فٹ نیچے گہرائی میں اترتی تھی اور ڈھلوان کو اگر نامکمل کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ یہ صورتِ حال تھی۔ قدم بمشکل روک کر جو میں نے نیچے دیکھا تو وہاں دور دور تک کسی جانور کی ہڈیاں بکھری پڑی نظر آئیں۔ یقیناً اس تیز ڈھلوانی اور اندھے، نامکمل Fall سے گرا ہو گا اور نیچے 250 فٹ کی گہرائی میں اتنی شدت سے زمین سے ٹکرایا ہو گا کہ اس کا جسم پھٹ گیا۔ اس کی ہڈیاں اس طرح بکھری پڑی تھیں کہ اوپر

سے لگتا تھا جیسے Radiate والا نظارہ ہو۔ میں یقیناً ایک ناگہانی موت سے بال بال بچ گیا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخصوص سُنت سے مجھے میری والدہ کی آواز کے ذریعے بچایا تھا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور اُلٹے قدموں واپسی کی راہ لی۔

کیمپ واپس آکر ساتھیوں کے ساتھ اس واقعے کا ذکر کیا اور اپنے اندر ایمان کی مضبوطی کو پنپتے ہوئے پایا۔ بعد میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہوتے دیکھے۔

اسی طرح ایک دن اسی روٹ پر سروے کے دوران میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ یہ غالباً راندھن کے علاقہ کی بات ہے۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ گہرے بادل اور فرحت بخش ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی، اس لیے مٹر گشت کرنا بہت پُر لطف لگ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ جہاں کوئی پہاڑ کا حصہ دیکھتا، وہاں برقی آلہ سے چیک بھی کرتا جاتا۔ یہ ایک وسیع و عریض میدان تھا اور یہاں مقامی لوگوں نے گندم کی فصل لگائی ہوئی تھی۔ شاید دسمبر یا جنوری کا مہینہ تھا، اور سارا منظر سبز چادر اوڑھے ہوئے لگتا تھا۔ اس لمحے اپنے پروفیشن پر بہت پیار آرہا تھا کہ قدرت نے اس نوکری کی وجہ سے اپنی کارگزاریاں دیکھنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ نہایت حسین و دلفریب منظر تھا کہ ایک کھیت کے بیچوں بیچ ایک سفید رنگ کا بہت پیارا اور معصوم سا جانور نظر آیا۔ میں جیسے جیسے نزدیک پہنچ رہا تھا، اس جانور کے خد و خال واضح ہوتے جا رہے تھے اور وہ جانور بھی قدرے بے چین لگ رہا تھا۔ جب بالکل پاس پہنچا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ ایک سفید لومڑی تھی اور مقامی شکاریوں کے لگائے گئے ایک شکنجے میں پھنسی ہوئی تھی۔ دور دور تک کوئی اور ذی روح نہ تھا۔ میں جیسے ہی اس کے قریب پہنچا، وہ مزید

بے چین ہو گئی اور گھبراہٹ میں بھاگنے کی کوشش میں اسی شکنجے کے گرد گھومنے لگی۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے اتنی شدومد سے کوشش کی کہ اس کی پھنسی ہوئی ٹانگ کا گوشت اتر گیا اور سفید ہڈی نظر آنے لگی۔ اس کی بھولی شکل، جس پہ مجھے بے انتہا ترس آیا، مجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں نے بھی اسے آزاد کرنے کی ٹھان لی۔ ہم جیالوجسٹ لوگوں کے پاس ایک مخصوص ہتھوڑا ہوتا ہے جو ہمیشہ فیلڈ ورک میں ساتھ ہوتا ہے۔ یہ نہایت سخت اور ٹھوس دھات کا بنا ہوتا ہے کیوں کہ یہ چٹانوں کو توڑنے اور نمونہ جات کو اکٹھا کرنے میں کام آتا ہے۔ میں نے ہتھوڑا پکڑا اور تاک کر اس شکنجے پر آزمایا تاکہ وہ شکنجہ ٹوٹے اور لومڑی آزاد ہو جائے۔ لیکن جیسے ہی میں شکنجے پر ہتھوڑے کی ضرب لگانے لگتا، وہ لومڑی گھوم گھام کے میرے سامنے آجاتی اور میں بمشکل اپنا ہاتھ روک پاتا۔ اس زور آزمائی میں میری تھکاوٹ میں ازحد اضافہ ہو رہا تھا۔ جھنجھناہٹ الگ ہو رہی تھی۔ شام کا وقت تھا اور کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی تھی۔ ادھر یہ لومڑی میری تمام کوششوں کو، جو میں اس کی آزادی کی خاطر کر رہا تھا، ناکام بنا رہی تھی۔ غصہ کچھ اور بڑھ گیا، اور پھر جب مزید بڑھا تو میں نے اس لومڑی کو انسان سمجھتے ہوئے یا اپنے آپ کو حیوان، مادری زبان میں ایک دو گالیاں رسید کرتے ہوئے کہا، 'پیچھے ہٹ جاؤ اور آرام سے بیٹھو۔ میں تمھیں آزادی دلانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم مجھے مسلسل ناکام بنائے جا رہی ہو۔' میری اس غصیلی بات نے شاید اپنا کام کر دیا اور وہ جتنی دور ہو کر بیٹھ سکتی تھی، بیٹھ گئی اور شکنجے کو میرے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ مجھے جیسے ہی احساس ہوا کہ موقع اچھا ہے، میں نے ایک

زبردست وار کیا اور شکنجہ ٹوٹ گیا۔ جیسے ہی شکنجہ ٹوٹا، لومڑی گولی کی طرح وہاں سے بھاگی اور میں نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا۔ اب ایک آدھ فرلانگ کے فاصلے پر جا کر لومڑی رُکی اور اپنی تھوتھنی میری طرف کر کے مجھے دیکھنے لگی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ 'بہت بہت شکریہ۔' میں نے بھی اپنی زبان میں اسے جواب دیا، 'ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جاؤ، اب اپنا راستہ ناپو۔'

اب ایسے واقعات اور قدرت کی صناعی دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی طاقت اور اس کی وحدانیت اور اس کا شہ رگ سے قریب ہونا ایک حقیقت سمجھ کر اپنے پیشے پر اور بھی پیار آنا شروع ہو گیا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں نے ذکر سے بڑھ کر فکر کی طرف آنا شروع کر دیا۔ دل و دنیا میں ایک عجیب سی کیفیت اور سرور کا داخلہ ہو گیا۔

اسی دوران 1986 کا مون سون اپنے عروج پر تھا۔ کیمپ کے نیچے والا سانگھڑ نالہ ایک عظیم دریا کے روپ میں بدل گیا۔ ہمارا کیمپ اوپر ٹیرس پر تھا اور نیچے پانی۔ تمام راستے بند ہو گئے اور فیلڈ پر آنا جانا ویسے ہی رُک چکا تھا۔ اسی دوران رمضان شریف کا مبارک مہینہ شروع ہو گیا۔ جناب مرزا صاحب دین دار شخصیت کے مالک ہیں۔ ہم نے کیمپ میں ہی نمازِ پنجگانہ کا بندوبست کر لیا۔ نمازِ پنجگانہ تو ویسے بھی ادا کرتے تھے، خان صاحب نے کافی محنت کی تھی اس عمل کو شروع کرنے میں۔ لیکن اس دوران زیادہ تر نمازیں فیلڈ میں ادا ہوتی تھیں۔ پہلا روزہ آیا، تیاریاں شروع کی گئیں۔ چونکہ ماشاء اللہ سے کیمپ کے تمام افراد نمازی تھے، اس لیے سب نے مشورہ

کیا کہ نمازِ تراویح کا بھی اہتمام کیا جائے۔ حافظِ قرآن تو کوئی بھی نہ تھا اس لیے قرعہ مجھ جیسے گناہ گار کا نکلا اور قرآن پاک کی آخری دس سورتوں کی تلاوت کر کے بیس تراویح پوری کرنے کا ارادہ کر لیا گیا۔ گرمی بہت زیادہ تھی، حبس کا الگ راج تھا اور جنریٹر کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ فقط لالٹین کی روشنی میں مغرب کے بعد تمام کام مکمل کر لیے جاتے تھے۔ ایک ساتھی فقہ جعفریہ سے متعلق تھے، نام غالباً محمد حسین تھا اور وہ وائرلیس آپریٹر تھے۔ ماشاء اللہ وہ بھی ہمارے ساتھ باجماعت نماز ادا کرتے تھے، غرضیکہ اتحاد بین المسلمین کا عظیم مظاہرہ تھا۔

اب ہم ٹھہرے لاہور کے، جہاں رمضان شریف وہ بھی گرمی والا بغیر دہی، لسّی، پراٹھے، سکنجبین، روح افزا، دودھ سوڈا وغیرہ ہر قسم کے اہتمام کے بغیر روزے کا تصور محال تھا اور کہاں یہ علاقہ جہاں دہی، دودھ سوڈا، ٹھنڈے ٹھار شربتوں کا تصور ہی ناپید تھا۔ اس لیے سوچا کہ چلو ٹھنڈا پانی تو میسر ہو، اس کا بندوبست کیا جائے۔ اسی تگ و دو میں علم ہوا کہ بارتھی کے سردار کے گھر کے سامنے ایک برف فروش ہے جو تونسہ سے اپنے زورِ بازو پر برف منگاتا ہے، فقط اس سے برف حاصل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ میں اور مرزا صاحب اس کے پاس گئے اور اس زمانہ میں اس سے 5 روپے فی کلوگرام کے حساب سے چار کلو برف خرید کر لائے اور افطاری میں ٹھنڈے مشروب کا استعمال ممکن ہوا۔

گرمی کے طویل روزے، اوپر سے پنکھے اور جنریٹر ندارد، دوپہر کو مکھیاں نہ صرف بھنبھناتی تھیں بلکہ کاٹتی بھی تھیں، اس لیے تمام دن بے چینی میں گزرتا تھا۔

قرآن پاک کی تلاوت کرتے کرتے تھک جاتے لیکن دن تھا کہ کٹتا ہی نہ تھا۔ دوسری مصروفیات بھی نہ ہونے کے برابر تھیں لہٰذا وقت گزارنے کے لیے نیچے پانی کے جوہڑ میں مچھلیوں کا شکار کرنا شروع کر دیا۔ مچھلی کے شکار کے لیے مناسب کیل کانٹے تو نہ تھے اس لیے کامن پن کو موڑ کر کانٹے کی شکل دے کر اس میں روٹی کا ٹکڑا پھنسا کر جوہڑ میں لٹکا دینا اور بھوکی مچھلی کا اس کی طرف لپکنا اور ساتھ ہی میں نے جھٹکا دے کے کانٹے کو مچھلی سمیت باہر نکال لینا۔ یہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں زیادہ سے زیادہ چھ انچ لمبی ہوتی تھیں لیکن مشغلہ اچھا ہاتھ آ گیا تھا۔ یوں دو تین گھنٹے کی مصروفیت میسر آ گئی تھی۔ روزانہ پانچ سات مچھلیاں ہاتھ آ جاتیں اور افطاری کے سامان میں ان کا اضافہ بھی ہو جاتا۔ مرزا صاحب میرے اس مشغلے سے واقف ہو گئے تھے لیکن دور دور ہی سے دیکھتے، اس میں شامل نہ ہوتے۔ ایک دن میں مچھلی کے شکار پر نہ جا سکا بلکہ مزید دو دن بھی ناغہ ہو گیا تو وہ میرے کمرے میں آئے اور گویا ہوئے۔ ”آؤ قریشی صاحب! مل کر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔“ میں بے حد خوش ہوا کہ وہ بھی اس شغل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ (یہ الگ بات کہ اس دن کوئی مچھلی ہاتھ نہ آئی۔) تھوڑی دیر کے بعد، ہم خالی ہاتھ کیمپ واپس لوٹ آئے۔

گرمی اتنی شدید ہو چلی تھی کہ میں نے دوپہر کے وقت چارپائی پر دری بچھا کر اس پر دو تین لوٹے پانی کے بہا کر بغیر بنیان کے لیٹنا شروع کر دیا۔ یہ کام جناب مرزا صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ خود بھی یہ طریقہ کافی دنوں سے اپنائے ہوئے تھے لیکن یہ کوئی دیرپا اور فرحت بخش طریقہ نہ تھا۔ کیونکہ کچھ ہی دیر بعد بھڑاس کا عمل شروع

ہو جاتا اور مزید کوفت محسوس ہونے لگتی تھی۔

اسی دوران ایک دن ہم سب لوگ فیلڈ میں کام کر رہے تھے کہ ایک انتہائی خوبصورت پنکھ غیر معمولی لمبائی اور ساخت کا ملا۔ عزیز الیکٹریشن جو سیالکوٹ کا ایک شرارتی جوان تھا، وہ اس پنکھ کو لے کر جھومتا جھامتا چلا آ رہا تھا کہ مرزا صاحب نے اس سے وہ پنکھ لے لیا اور خود اسے کبھی انگلیوں میں گھماتے، کبھی اس پر ہاتھ پھیرتے اور اس کی ملائمت کو محسوس کرتے۔ یہ پنکھ تھا سیہہ کا۔ سیہہ ایک ایسا جانور ہے جو چوہے کی شکل کا ہوتا ہے لیکن قد میں کافی بڑا ہوتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کے جسم میں کانٹے دار بڑے بڑے سے پنکھ ہوتے ہیں جس سے یہ اپنے دشمنوں سے حفاظت اور مقابلہ کرتا ہے۔ عزیز الیکٹریشن نے جب دیکھا کہ اس پر مرزا صاحب نے تقریباً قبضہ کر لیا ہے اور ارادہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اسے گھر لے جائیں گے اور ڈرائنگ روم میں سجائیں گے تو بولا، 'سر جی! میں نے سنا ہے کہ یہ پنکھ جس کے گھر میں ہو وہاں بے برکتی اور بے سکونی ہوتی ہے۔' یہ سننا تھا کہ مرزا صاحب نے وہ پنکھ نہایت تیزی سے ایک طرف پھینک دیا۔ عزیز نے، جو پیچھے پیچھے آ رہا تھا، چپکے سے وہ پنکھ اٹھا لیا اور ہم سب اس کی کمال فنکاری کے قائل ہو گئے۔

ایک دن موہوئی کے فیلڈ سے واپسی پر بالکل ویسا سین ہوا جیسا جناب اجمل کے ساتھ ہوا تھا، پینے کا پانی بالکل ختم ہو گیا۔ پانی کا جوہڑ بھی سخت گدلا تھا۔ عصر اور مغرب کا درمیانی وقت تھا۔ پانی کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ میں نے گلاس پر اپنا رومال باندھا اور پانی بھرا۔ جب میں نے وہ پانی پی لیا تو مرزا صاحب نے کہا کہ ایک

گلاس مجھے بھی دو۔ میں نے اسی طرح پانی چھان کر ان کی خدمت میں پیش کیا تو ایک ہی گھونٹ پی کر گلاس سے منہ ہٹالیا اور بولے، 'اس میں سے تو اونٹ کے پیشاب کی سی بُو آ رہی ہے۔' میں نے عرض کیا کہ 'سر صرف بُو نہیں، بلکہ اصلی اور خالص اونٹ کا پیشاب بھی شامل ہے۔' بولے، 'میں نے نہیں پینا۔' اور واقعی انھوں نے باقی پانی زمین پر انڈیل دیا۔

ان جوہڑوں کے پانی کا مسئلہ صرف اونٹ یا دوسرے جانوروں کے پیشاب کا نہ تھا بلکہ اصل اور خوفناک مسئلہ اس میں موجود 'ناروان' کا تھا جو ایک خوردبینی کیڑا تھا اور اُن دنوں اس علاقے کے پانی والے جوہروں میں بکثرت پایا جاتا تھا۔ یہ جرثومہ انسانی جسم میں داخل ہو کر اس کی شریانوں میں شامل ہو جاتا تھا اور وہیں پرورش پاتا تھا۔ بعد میں دھاگے کی شکل میں پروان چڑھتا اور ہاتھ، پاؤں، گھٹنوں یا کلائیوں وغیرہ میں سے کسی جگہ سے باہر نکلنا شروع کر دیتا تھا۔ اس کا باہر نکلنا برگد کے درخت کی باہر والی جڑوں کی طرح ہوتا تھا جو دیکھنے میں انتہائی ہیبت ناک ہوتا تھا کہ اچھا بھلا آدمی ان کی وجہ سے خوفناک صورت اختیار کر لیتا۔ کھانا پینا تو ایک طرف، اس سے متاثرہ شخص کا سونا جاگنا بھی عذاب ہو جاتا تھا۔ ایک اور مشکل یہ تھی کہ آپ اس کیڑے کو کاٹ نہیں سکتے تھے کہ اس صورت میں فوراً انفیکشن ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات اس انفیکشن سے موت بھی واقع ہو چکی تھی۔ بس اس کیڑے کو ایک تنکے پر لپیٹنا پڑتا تھا تاوقتیکہ وہ سارے کا سارا جسم سے باہر نہ نکل آئے۔ جہاں سے یہ کیڑا نمودار ہوتا، وہاں بہت کھجلی ہوتی تھی اور مریض زیادہ تر پانی کے اندر ہی سکون

محسوس کرتا تھا۔ تونسہ کے ہی ایک ڈاکٹر نے ذاتی توجہ اور سرمائے سے اس کیڑے کے خاتمے کے لیے بہت جدوجہد کی اور ایک دوائی تیار کی جس کا سارے جوہڑوں میں سپرے کیا گیا اور اس کا قلع قمع کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ جب ہم 1985 میں ان علاقوں میں کام کر رہے تھے تو وہاں انھی ڈاکٹر صاحب کے اشتہار جگہ جگہ نظر آتے تھے کہ 'ناروان' کے مریضوں کی نشان دہی کرنے پر پانچ ہزار نقد انعام دیا جائے گا۔ اگر میں کہوں کہ ان جگہوں کا پانی پینے میں سب سے بڑا خطرہ 'ناروان' کا یہ جرثومہ تھا تو بالکل غلط نہ ہو گا۔

مون سون اپنے عروج پر آ گیا اور فیلڈ ورک کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ڈی جی خان سے جناب رانا صاحب نے بذریعہ وائرلیس حکم دیا کہ واپس ڈی جی خان رپورٹ کی جائے۔ چنانچہ بارتھی کیمپ عارضی طور پر بند کر دیا گیا اور ہم سب لوگ ستمبر 1986 کو ڈی جی خان میں موجود دفتر کے قریب دیوار کے ساتھ ساتھ خیمہ زن ہو گئے۔ جب ستمبر 1985 میں بارتھی گئے تھے تو سروے کا آفس پہاڑی علاقہ میں تھا لیکن جب واپس آئے تو کالونی میں قائم ایک پرانے سکول کی عمارت میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہیں پر جناب بھائی جان سے ملاقات ہوئی۔ یہ کسی اور پراجیکٹ سے اس پراجیکٹ میں ٹرانسفر ہوئے تھے۔

ذیلی ادارہ لاہور میں تحریری امتحان:

بارتھی فیلڈ ورک کے پورے ایک سال بعد محکمہ میں باقاعدہ بھرتی کے لیے

اخبار میں اشتہار آیا جس میں اسسٹنٹ جیالوجسٹ (گریڈ 16) اور جیالوجسٹ (گریڈ17) کی آسامیوں کے لیے امتحان اور انٹرویوز کی تاریخ دی گئی تھی۔ میں چونکہ یہاں پر ادارہ ایکسپلوریشن میں ڈیلی ویجر جیالوجیکل اسسٹنٹ کام کر رہا تھا، اس لیے اس امید پر درخواست جمع کرا دی کہ جیسے یہ پیشکش میرے لیے ہی ہے۔ اب چونکہ میں اسسٹنٹ جیالوجسٹ کی آسامی کے لیے موزوں تھا، اس لیے غنیمت کے طور پر اس کے لیے امتحان اور انٹرویو کے لیے تیار ہو گیا۔

رانا صاحب نے کسی قسم کی کوئی مدد کرنے سے انکار کر دیا اور بولے، 'بھائی تمھیں خود ہی اپنے آپ کو اس آسامی کا اہل ثابت کرنا ہے۔ مجھ سے کسی قسم کی مدد کی کوئی امید نہ رکھنا۔'

مینیجر سروے کمپنی محترم رانا صاحب کی شخصیت کئی معاملات میں متاثر کن ہے۔ رانا صاحب ہی مجھے اس عظیم ادارے میں لے کر آئے اور آغاز سے اب تک کئی پہلوؤں میں تربیت فرماتے رہے۔ آپ ایک مکمل ایکسپلوریشن جیالوجسٹ تھے۔ تھیڈولائٹ سروے، چپ لاگنگ، گیما لاگنگ اور ان سے منسلک گرافک کا تجزیہ وغیرہ سب پر مکمل مہارت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ڈرلنگ کے معاملات جو کافی پیچیدہ ہوتے تھے، ان پر بھی اچھا خاصا عبور رکھتے تھے۔ میں نے خود چپ لاگنگ اور گیما لاگنگ واجد علی خاں صاحب سے ہی سیکھی تھی۔ رانا صاحب بے حد زمانہ شناس رہے ہیں۔ دنیاوی معاملات کو خوب سمجھتے ہیں۔ چونکہ خود بھی سیلف میڈ تھے، اسی لیے ہر قسم کی حرکات وسکنات سے بخوبی آگاہ ہیں۔

بار تھی میں ایک بار میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور کوئی سیمپلنگ کا کام کر رہا تھا۔ انھی دنوں رانا صاحب بار تھی میں وزٹ پر تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو نزدیک آ کر کہنے لگے، 'او بھائی تیرا کام کرسی پر نہیں ہو سکتا۔ تو اپنا رزق زمین سے حاصل کرتا ہے لہٰذا زمین پر بیٹھ کر ہی زمین کے کام کر۔' میری شروع سے ہی عادت رہی ہے کہ میں اپنے سینئرز کا بہت احترام کرتا ہوں، سو فوراً آلتی پالی مار کر زمین پر بیٹھ گیا اور پھر جب بھی جیالوجی یا اس سے متعلقہ امور پر کام کرنے کا موقع ملا، تو میز کرسی کے مقابلے میں زمین پر بیٹھنے کو فوقیت دی۔ اسی طرح ایک دفعہ میں رانا صاحب سے تین دن کی چھٹی مانگنے گیا تو پوچھنے لگے، 'اس چھٹی کا کیا کرو گے؟ تمھاری تو شادی بھی نہیں ہوئی۔' میں نے عرض کی، 'سر جی ایک انٹرویو ہے، نئی روشنی سکیم میں، تو اسلام آباد میں جا کر انٹرویو دینا ہے۔' مجھے کہنے لگے، 'او بھائی، ایسی نئی روشنی سکیمیں سب سیاسی ہوتی ہیں۔ ان کا کوئی فائدہ نہیں۔ انٹرویو اس ڈیپارٹمنٹ میں دو جہاں سے متعلق تم نے ایم ایس سی کی ہے۔' یہی بات میرے مرحوم والد صاحب نے بھی کہی ہوئی تھی۔ بہر حال انھوں نے چھٹی دے دی اور میں نے اسلام آباد جا کر انٹرویو بھی دے دیا۔ لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں آیا۔ ایسے ہی ایک دفعہ میں نے رانا صاحب سے گزارش کی کہ 'سر میرے والد صاحب آج کل ایڈمن آفیسر انکم ٹیکس ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ڈی جی خان سے لاہور ٹرانسفر کروانی ہے تو بتاؤ کیونکہ مجھے ایک سفارش ملی ہے جو یہ کام کر سکتی ہے۔ تو سر میں درخواست برائے ٹرانسفر لکھتا ہوں، آپ برائے مہربانی سفارش کر دیں۔' تو کہنے لگے کہ 'او بھائی، لاہور میں ٹرانسفر تو ہو

جائے گی لیکن میرا مشورہ مانو تو لاہور جانے سے پہلے اپنے آپ کو ذہنی، تکنیکی اور سینیارٹی کے حساب سے طاقتور کرلو، کیونکہ لاہور میں سہولت سے رہنے کے لیے ان باتوں کی بہت ضرورت ہے۔ لہٰذا ابھی اپنے کام میں مزید نکھار لاؤ اور تھوڑے اور سینئر ہو جاؤ تو پھر لاہور چلے جانا۔'

یہ رانا صاحب کی دور اندیشی تھی کہ جب میں لاہور آفس آیا تو ایک سے بڑھ کر ایک قابل اور ماہر تکنیک کار پایا اور رانا صاحب کو دعائیں دیں جنھوں نے یہ ضروری مہارت حاصل کر کے لاہور جانے کا مشورہ دیا تھا۔

قصہ مختصر، امتحان دینے کے لیے ذیلی ادارہ کے دفتر مقررہ دن پہنچ گیا اور پرانے دروازے کے ساتھ دائیں طرف ایک خوبصورت ہرے بھرے لان میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر انتظار کرنے لگ گیا۔ اظہر صاحب وہاں پر نگران کی حیثیت سے موجود تھے اور نہایت سختی سے اپنی فرائض انجام دے رہے تھے۔ میں چونکہ اظہر صاحب سے تھوڑی شناسائی رکھتا تھا اس لیے ان سے تھوڑا بے تکلف ہو کر ایک سوال کا جواب جاننا چاہا لیکن انھوں نے مدد کرنے کے بجائے ہلکا سا ڈانٹ دیا۔ پھر میری جرأت نہ ہوئی کہ ان سے مزید بے تکلفی اختیار کی جائے۔ امتحان سے فراغت پا کر انٹرویو کا مرحلہ آیا تو ڈائریکٹر صاحب کے دفتر میں یونس صاحب، علوی صاحب مرحوم، شاہد صاحب اور ایک دو صاحبان جو غالباً اسلام آباد سے آئے ہوئے تھے، ایک بورڈ کی حیثیت سے موجود تھے۔ علوی صاحب تو چونکہ کافی مشہور آدمی تھے اس لیے اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔ باقی صاحبان کے نام سن رکھے تھے لیکن

بالمشافہ ملاقات آج ہی ہو رہی تھی، اس لیے دل دھڑک رہا تھا۔ بہر حال آسان سا انٹرویو ہوا اور ہم واپس ڈی.جی خان آ گئے۔

تعیناتی بحیثیت سائنٹسٹ:

انٹرویو ہونے کے غالباً دو ماہ بعد افضل صاحب، بوٹا صاحب اور ڈار صاحب بحیثیت اسسٹنٹ جیالوجسٹ متعین ہو گئے اور ارشد صاحب اور شہزاد احمد خان صاحب بحیثیت جیالوجسٹ پراجیکٹ میں تعینات کیے گئے۔

میرا تقرر نامہ ابھی تک نہیں آیا تھا اور میں کسی حد تک گومگو کی کیفیت میں تھا، کیونکہ محمد بوٹا صاحب اور ڈار صاحب باقاعدہ اپنی ذمہ داریاں نبھانا شروع کر چکے تھے اور مجھے جنوری 1987 تک تقرر نامہ نہ مل پایا تھا۔

ایک دن جناب علوی مرحوم کیمپ تشریف لائے اور دو تین دن کے لیے اپنے وی آئی پی پورٹا کیبن میں رہائش پذیر ہو گئے۔ ایک دو دفعہ آمنا سامنا بھی ہوا اور ہماری سلام دعا بھی ہوئی۔ اسی دوران کسی ساتھی نے بتایا کہ خوش قسمتی سے علوی صاحب آئے ہوئے ہیں، ان سے اپنی تقرری کی بات کرو۔ مجھ میں بالکل بھی ہمت نہ تھی، بلکہ شرم محسوس کرتا تھا اور سب سے بڑی بات جناب علوی صاحب کی ہیبت اور دبدبہ اتنا زیادہ تھا کہ میں جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا، لیکن جب اللہ کو منظور ہو تو راستے آسان ہو جاتے ہیں۔

ہوا یوں کہ ہمارا ہر دلعزیز باورچی "مرید مرحوم" (صاحب جی) کیمپ میس

میں آٹا گوندھ رہا تھا جو وزن میں کافی زیادہ تھا، اس لیے وہ روایتی عورتوں کی طرح اینٹ پر بیٹھ کر گوندھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں اس کے پاس گیا۔ پوچھا، ”مرید! میرا ایک کام کرو گے؟“

”کیوں نہیں صاحب جی، حکم کریں۔“

میں بولا: ”حکم کوئی نہیں بس علوی صاحب سے میری ملاقات کے لیے اجازت لے دو۔ میں نے ان سے اپنی تقرری کی بات کرنی ہے۔“

یہ سن کر وہ جنّتی یکدم اُٹھا، ہاتھ دھوئے اور بولا، ”صاحب جی آپ ادھر بیٹھیں، میں ابھی آیا۔“

چنانچہ میں ادھر ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کو علوی مرحوم کے وی آئی پی پورٹا کیبن میں جاتے دیکھنے لگا۔ ساتھ ساتھ یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں انکار ہی نہ ہو جائے۔ دل دھڑک رہا تھا کہ ڈانٹ ہی نہ پڑ جائے۔ لیکن اللہ کی مدد ڈھارس بندھا رہی تھی۔ چونکہ وی آئی پی پورٹا کیبن اور میس کے درمیان فاصلہ تھوڑا ہی تھا، اس لیے حرکات و سکنات کے علاوہ آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ استاد مرید (مرحوم) اپنے خاص انداز میں دونوں ہاتھ حالتِ نماز کی طرح باندھے علوی صاحب کے کیبن میں پہنچا اور خوش قسمتی سے کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ علوی صاحب کچھ لکھنے کا کام کر رہے تھے۔ استاد مرید ویسے ہی ہاتھ باندھے انتہائی مؤدبانہ اور عاجزانہ طریقے سے گویا ہوئے کہ ’صاحب جی، ایک عرض کرنی ہے، اجازت دیں۔‘ اجازت ملنے کے بعد کہنے لگا:

”صاحب جی ہمارے یہاں ایک عباس قریشی صاحب ڈیلی ویجر کام کرتے ہیں،

وہ اجازت کے منتظر ہیں، ان کو آپ سے کوئی کام ہے۔ صاحب جی آپ کا کیا حکم ہے؟"

علوی صاحب بولے کہ 'اچھا، انھیں بھیج دو۔'

استاد مرید بڑے ادب سے دو تین قدم پیچھے کھسک کر بولا، 'مہربانی صاحب جی!'

اسی طرح نظریں زمین پر گاڑے پیچھے پیچھے آتا ہوا مرید استاد میرے پاس آگیا اور بولا: "صاحب جی نے ملاقات کی اجازت دے دی ہے۔ آپ ان سے مل سکتے ہیں۔"

میں نے ایک لمبا سانس لیا، اپنے اعضا کو پُر سکون کر کے دل بڑا کیا اور جناب علوی کے سامنے حاضر ہو گیا۔ میں نے سلام عرض کیا تو انتہائی پُر شفقت لیکن بردبار انداز میں بولے، "تمھارا تقرر نامہ جلد ہی آجائے گا، فکر نہ کرو۔"

بس، ان سے یہی بات ہوئی اور میں شکریہ ادا کرنے کے بعد استاد مرید کے پاس واپس آیا اور اس کا بھی شکریہ ادا کیا۔

کچھ دنوں بعد راجن پور فیلڈ کیمپ برائے ابتدائی سروے پلاننگ میں شامل ہوا اور اسی دوران جناب مرزا صاحب ڈی جی خان سے ذیلی ادارہ لاہور ٹرانسفر ہو گئے اور ان کی جگہ قمر صاحب تشریف لائے۔ قمر صاحب کافی کھُلی ڈُلھی طبیعت کے مالک نظر آئے۔ لاہور سے تعلق تھا، اس لیے ان کی عادات بھی مکمل لاہوریوں جیسی تھیں۔ ہنسنا کھیلنا، قہقہے لگانا ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ (ماشاء اللہ ابھی حیات ہیں اور

ویسی ہی طبیعت رکھتے ہیں!) 2012 میں بحیثیت سینئر ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے تو راجن پور کیمپ برائے سروے کے انچارج قمر صاحب کو بنایا گیا اور دیگر سٹاف میں جناب خان صاحب اور میں (بحیثیت پرنسپل جیالوجیکل اسسٹنٹ کے) شامل تھا۔ اب میری روزانہ اُجرت 52 روپے سے بڑھ کر 72 روپے تک ہو گئی تھی۔

کیمپ ''کہا'' ندی کے کنارے لگایا گیا اور چونکہ موسمِ بہار کی آمد آمد تھی اس لیے ہر چیز خوبصورت اور دل کش لگ رہی تھی۔ لیکن جونہی شام ہوتی، قسم قسم کے سانپوں سے ٹینٹ کے ارد گرد کا علاقہ بھر جاتا۔ قمر صاحب کو رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی کا بہت شوق تھا۔ چہل قدمی کرتے ہوئے ٹارچ کی روشنی میں اکثر سانپ نظر آجاتے جن کو میں پتھر سے مار دیتا تھا۔ ایک دفعہ ایک جلیبی سانپ جو کہ بہت خوفناک آوازیں نکال رہا تھا، بڑی مشکل سے مرا، لیکن خوف اور ڈر ساتھ ساتھ رہے۔

ایک دن سروے کے دوران برقی آلہ سے چیکنگ کے دوران ایک سوراخ میں مَیں نے برقی آلہ کی نوزل ڈالی۔ جیسے ہی نوزل اندر گئی، یک لخت ایک سانپ، جس کی لمبائی ایک میٹر سے بھی زیادہ تھی، تقریباً اُڑتا ہوا باہر آیا۔ وہ مجھے اور میں اس کو دیکھ کر ڈر گیا۔ سوراخ سے باہر نکلتے ہی وہ چھلانگ لگا کر زمین پر گرا۔ وہ اب بھاگنے کی سوچ رہا تھا لیکن میں ہوش میں آچکا تھا۔ بس پھر دو چار پتھروں کے وار سے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس دوران میں پانچ دن میں پانچ سانپ مار چکا تھا۔ قمر صاحب ازراہِ مذاق کہنے لگے کہ 'یا تو سانپ تمھارے دوست ہیں یا تم سانپوں کے۔ جتنے سانپ تم

نے مارے ہیں اتنے سانپ تو میں نے دیکھے بھی نہیں۔'

اگلے دن میں، خان صاحب، قمر صاحب اور بقیہ ٹیم سروے کے لیے کھلگری ندی کی طرف جا رہے تھے کہ یکایک فائرنگ کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ یوں لگا جیسے ہمارے سر کے اوپر سے گولیاں گزر رہی ہوں۔ پہلے ہم نے سوچا کہ مقامی لوگ فائرنگ کی مشق کر رہے ہوں گے لیکن شام کو کیمپ میں پہنچ کر علم ہوا کہ وہ مشق ہماری ٹیم پر ہی ہو رہی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب!

اسی رات کو جناب نسیم مرحوم سنگل کیبن گاڑی میں ہمارے کیمپ میں تشریف لائے اور ساتھ ہی میرا تقرر نامہ بھی آن پہنچا۔ آتے ہی پہلے تو مبارک باد دی، پھر کہا: "میں تمھیں ساتھ لینے آیا ہوں۔ کل لاہور میں اپنا میڈیکل کرواؤ اور جوائننگ دو۔"

بے انتہا خوشی اور مسرت نے آ لیا۔ ہر کوئی مبارک دے رہا تھا اور ساتھ ہی دعوت کی فرمائش بھی۔ چنانچہ 450 روپے نقد میں ایک عدد بکرا خریدا گیا اور سارے کیمپ کی دعوت کی گئی۔ یہ خط 26 مارچ 1987 کو آیا اور یوں ایک سال اور آٹھ مہینوں کے بعد میں ڈیلی ویجر سے پکا ملازم ہو گیا۔ عہدہ تھا اسسٹنٹ جیالوجسٹ گریڈ 16 اور تعیناتی تھی پاکستان کے ایک ادارہ ڈی جی خان میں۔

لاہور سے میڈیکل چیک اپ کروا کے میں 5 اپریل 1987 کو ڈی جی خان کے لیے روانہ ہوا اور 6 اپریل 1987 کو مین آفس جوائن کر لیا۔ انھوں نے پوسٹنگ پرانے پراجیکٹ میں ہی رکھی اور چند دن اپنے آفس میں گزارے۔ اسی اثنا میں

جناب جونئیر بٹ صاحب نے بھی جوائن کر لیا۔ یہ غالباً 18 اپریل کی تاریخ تھی۔ بعد ازاں ہم دونوں کو جناب رانا صاحب نے ایک لیٹر دیا اور ہماری عارضی پوسٹنگ دوسرے ذیلی پراجیکٹ میں کر دی گئی۔

سخی سرور کے شمال میں:

ڈیلی ویج سروس کے دوران ایک دفعہ اس علاقے کے کیمپ کو دیکھنے اور اس کے میس میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تھا، اور اللہ غریقِ رحمت کرے، شیخ صاحب (مرحوم) ہمراہ لے کر گئے تھے۔

شیخ صاحب مرحوم بڑی باغ و بہار شخصیت تھے۔ اس پراجیکٹ کے ذیلی ادارہ لاہور میں بطور ہیڈ سروے کے طور پر کام کر رہے تھے۔ جب علوی صاحب نے شیخ صاحب کی صلاحیتوں کا ادراک کرتے ہوئے انھیں ڈی جی خان بلایا۔ شیخ صاحب اُس ٹیم کا حصہ تھے جس نے ادارہ کے لیے بے حد خدمات سر انجام دیں تھی۔ نہایت محنتی، ذہین، ایماندار اور کام کے ساتھ جُتے رہنے والی شخصیت تھے۔ بنیادی طور پر شیخ صاحب کا قصور شہر سے تعلق تھا اور بیگ صاحب کے نزدیکی رشتہ دار تھے۔

شیخ صاحب مرحوم دسمبر 1985 میں ایک فرانسیسی جیالوجسٹ مائیکل شیئنے کے ساتھ بارتھی کیمپ میں تشریف لائے تھے۔ چونکہ بارتھی اور اس کے مضافات میں موہوئی، راندھن، تھل سر، ترنگ اور ڈمبھار وغیرہ میں غیر معمولی گوہر مقصود والے سپاٹ تھے، اس لیے وہ خود اور فرانسیسی ماہران سپاٹس کی قدر و منزلت طے

کرنے آئے تھے۔ فرانسیسی ماہر کافی بوڑھا تھا، عمر تقریباً ستّر سال سے اوپر تھی، اس لیے زیادہ پیدل نہیں چل سکتا تھا۔ ہم نے اسے تھل سر سے ترنگ تک پیدل چلا دیا۔ اس پر وہ کافی ناراض بھی ہوا۔

ایک دن کام کرتے کرتے ترنگ کے علاقہ میں ہم لوگ ایک گہری کھائی میں کام کر چکے تو واپسی پر نقشہ وہیں بھول آئے۔ یہ کھائی کافی گہری تھی اور اس کی دیواریں بالکل عمودی۔ وہاں اترنا چڑھنا بہت مشکل تھا۔ اس کے عین وسط میں ایک جوہڑ بھی تھا، جہاں سے مقامی عورتیں پانی بھرتی تھیں۔ انھوں نے اترنے چڑھنے میں سہولت کے لیے دیوار کو کھود کھود کر سیڑھیاں سی بنالی تھیں۔ لیکن یہ بھی ایک دشوار راستہ تھا اور صرف مقامی خواتین ہی اس کو استعمال کرنے میں تاک تھیں۔

بہرحال جب ہم کیمپ میں پہنچے تو صورتِ احوال معلوم ہوئی کہ جناب اس علاقے کی ٹوپو شیٹ (اصل والی) وہیں بھول آئے ہیں تو جسم سے جیسے جان نکل گئی ہو۔ ایک تو ٹوپو شیٹ کی اہمیت، دوسرا شیخ صاحب مرحوم کا غصہ اور تیسرے ہمارے دن کا کام رات کو کیمپ میں رپورٹ کرنے کے لیے اس ٹوپو شیٹ کی ضرورت، اور سب سے اہم کام یہ کہ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ لیکن ان تمام مسائل کے باوجود میں نے ڈرائیور کو پکڑا اور ایک عدد ٹارچ ہاتھ میں لے کر اسی راستے سے واپس کھائی تک پہنچا۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو ٹوپو شیٹ عین وسط میں پڑی نظر آ گئی۔ چاروناچار اسی مقامی عورتوں والے راستے کا انتخاب کیا اور ٹِن ٹِن کرتا نقشہ لے کر باہر نکل آیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور جھٹ سے گاڑی میں بیٹھ کر کیمپ کا رُخ کیا۔ جب گاڑی

کیمپ میں پہنچی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ خیال تھا کہ سب سو چکے ہوں گے لیکن شیخ صاحب مرحوم چہل قدمی کر رہے تھے اور ہمارے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کو ساری رپورٹ دی اور ایک آدھ نصیحت سن کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔

اگلے دن تھل سر کے معدنی سپاٹ دیکھنے تھے جن کی خصوصی اہمیت بھی تھی، لیکن اسی رات بارش ہوئی اور سارے سپاٹ یک رنگ ہو گئے۔ بارش کی وجہ سے ان کی رنگت بھی چھُپ گئی۔ میں نے ان سپاٹ کے ارد گرد پتھروں کے ہالے بنائے تھے تاکہ بھول نہ جاؤں لیکن جس ہالے کو بھی کھولوں، گوہر مقصود کو غائب پاؤں۔ شیخ صاحب مرحوم کی تلخ کلامی کو برداشت کرتے اِدھر اُدھر دیکھوں کہ شاید کہیں کوئی قابلِ غور چیز نظر آئے لیکن جب تک دھوپ نہیں نکلی، تب تک وہ گوہرِ نایاب بھی نہیں اُبھرا۔ بہرحال شیخ صاحب نے اس معدن کے بارے میں ایک طویل سَیر حاصل لیکچر دیا اور پہلی دفعہ فلسفۂ معدن سے آگاہی ہوئی۔ بعد میں تو یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔ شروع شروع میں اکتاہٹ محسوس ہوئی لیکن بعد میں جب سمجھ آنا شروع ہو گئی تو کافی آسودگی محسوس ہونا شروع ہو گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ جتنی بھی ٹوٹی پھوٹی معدنی جیالوجی کی معلومات سے آگاہی ہوئی، وہ سب شیخ صاحب کی عطا کردہ ہے۔ اس لیے ذہن ان کو استاد کی حیثیت سے تسلیم کر چکا تھا۔

بہرحال میں نے اور جونیئر بٹ صاحب نے پراجیکٹ کو جوائن کر لیا اور اللہ غریقِ رحمت کرے چوہان صاحب (پرنسپل انجینئر) کو جنھوں نے میری ڈیوٹی نارتھ میں لگائی، جس کے انچارج انعام صاحب مرحوم تھے، اور جونیئر بٹ صاحب کی ڈیوٹی

ساؤتھ میں لگائی، جس کے انچارج مسعود صاحب تھے۔

پہلے ہی دن مائن میں اُترے، گم شوز پیروں میں، ٹارچ والی ہیلمٹ سر پر جمائے، بارود کی بُو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ کان کی دیواریں لکڑی کے سہارے اور چھت لوہے کی جالی سے آراستہ۔ مائن واٹر کے پونڈ، بگھیاں اور لوڈر رواں دواں تھے، اچھا خاصا شہر آباد تھا۔ پھر کام سیکھا اور ایک ہی ہفتے کے بعد اس علاقہ کا سب سے بڑا تحفہ 'ملیریا' مل گیا جو بعد میں ٹائفائیڈ کی شکل اختیار کر گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ زندگی میں پہلی دفعہ ملیریا اور ٹائفائیڈ اس علاقہ میں ہوئے۔ اللہ کسی دشمن کو بھی یہ بیماریاں نہ لگائے۔ جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار، کھانے پر متلی کا احساس، بدن میں دردیں اور سب کچھ غیر صحت مند منظر۔۔۔۔

اسی صورتِ حال کا سامنا کرتے ہوئے ایک شام شہزاد اور ارشد صاحب تشریف لائے۔ میں نے ارشد صاحب کا نام سن رکھا تھا لیکن بالمشافہ ملاقات نہ ہوئی تھی۔ انتہائی صاف ستھری شخصیت کے مالک، داڑھی مونچھ صاف، انتہائی نفیس لباس میں ملبوس ارشد صاحب جیالوجسٹ تو کسی صورت نظر نہ آتے تھے، بلکہ دھیان فوراً جناب مرزا صاحب کی طرف گیا جن کو ہم لوگ کہتے تھے کہ انھیں جیالوجسٹ کی بجائے ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا۔ بعینہ ویسے ہی ارشد صاحب ڈاکٹر لگتے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کمزوری نے ایسا نہ کرنے دیا۔ تھوڑی دیر تک بات چیت ہوئی۔ پھر شہزاد صاحب جو کہ میرے کلاس فیلو اور بے تکلف دوست تھے اور جب میں نے جوائن کیا تھا تو یہ دونوں اصحاب چھٹی پر

گئے ہوئے تھے، انھوں نے مجھے آرام کا مشورہ دیا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت ہو گئے۔

اسی شب ایک سائیٹ میں میں میری رات کی شفٹ میں ڈیوٹی تھی اور ساتھ جناب حسن صاحب (اے-ای) تھے کہ سرکاری گاڑی چلانے کے شوق میں گاڑی اس پورٹا آفس میں دے ماری جہاں شفٹ انچارج بیٹھتے تھے۔ جب گاڑی نے شفٹ آفس کو ہِٹ کیا تو جناب حسن صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بچا لیا کہ جیسے ہی آفس ہِٹ ہوا، حسن صاحب نماز میں قیام پذیر تھے اور اچھل کر سیدھا سجدے میں آ گئے۔ درمیان میں سے رکوع غائب۔ بہرحال میری اس غلطی کو دوستوں نے چھپایا اور راتوں رات گاڑی کا جو نقصان ہوا، وہ عارف صاحب (ورکشاپ انچارج) نے ٹھیک کروالیا۔ گو بعد میں جناب ریاض صاحب (مرحوم) اور رانا صاحب نے کافی ڈانٹا۔

اس واقعے کے بعد بخار کی شدت میں اضافہ ہو گیا اور میں چھٹی لے کر لاہور اپنے گھر آ گیا۔ یہاں علاج معالجہ کروایا۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا اور اس بیماری کے باعث میرے پندرہ روزے چھوٹ گئے۔ پھر طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد دوبارہ پراجیکٹ حاضر ہو گیا اور مکمل صحت یابی کے بعد پراجیکٹ کے ماحول میں رَچ بس گیا۔ جناب شہزاد صاحب نے OGDC جوائن کرنے کے لیے محکمہ سے استعفیٰ دے دیا۔ شہزاد صاحب کی کمی کافی حد تک اور عرصہ تک محسوس ہوتی رہی۔

یہ پراجیکٹ ڈی.جی خان سے شمال مغرب کی طرف کافی دوری پر ہے۔ یہ ایک

دور افتادہ قبائلی علاقہ ہے جہاں لغاری اور بزدار قبائل آباد ہیں۔ اس جگہ پر معدن کی دریافت کا سہرا ایک نامی گرامی جیالوجسٹ کے سر ہے جو انھوں نے 50 کی دہائی میں کی تھی۔

موجودہ سیٹ اَپ میں جناب یعقوب صاحب، جناب ظہیر صاحب، جناب انعام صاحب اور جناب مسعود صاحب مائننگ گروپ میں سینئر حضرات تھے۔ ان کے علاوہ اقبال صاحب، ملک صاحب، قریشی صاحب، خواجہ صاحب اور جیالوجسٹ کیٹگری میں چودھری صاحب، ارشد صاحب، مظہر صاحب، ملک صاحب، عبد الرحمٰن صاحب اور جونئیر بٹ صاحب بھی تھے۔ مکینیکل کا شعبہ جناب منصور صاحب، جناب رفیق صاحب، جناب شمسی صاحب اور نعیم صاحب پر مشتمل تھا۔ ایڈمن اور سیکیورٹی کے افسران کے علاوہ بینک مینیجر اور ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ اب مجھے تمام لوگوں کے نام یاد نہیں لیکن کُل 35 افسران تھے جو اس پراجیکٹ میں قیام پذیر تھے۔

رات کو بیڈمنٹن کا کھیل اپنے عروج پر ہوتا جو تقریباً رات 12 بجے تک چلتا۔ چند بہترین کھلاڑیوں میں ظہیر صاحب، ملک صاحب، ارشد صاحب، اقبال صاحب، جونئیر بٹ صاحب اور منصور صاحب شامل تھے۔

سب خوش گفتار اور خوش مزاج لوگ تھے۔ اپنے اپنے سرکاری فرائض سرانجام دینے میں کامل، دین و دنیا دونوں سے باخبر اور برجستہ۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد اکلوتے رنگین ٹی وی سے خوب لطف اندوز ہوتے۔

پراجیکٹ آفیسرز کالونی میں کوئی کمرہ خالی نہیں رہا تھا۔ ماسوائے مینیجر اور دو یا تین سینئر آفیسرز کے باقی تمام کمرے دو یا زائد آفیسرز کے استعمال میں تھے۔ میں جونیئر بٹ صاحب اور خٹک صاحب (جیالوجسٹ) چونکہ دوسرے پراجیکٹ کی Strength میں تھے اس لیے ویسے بھی آفیسرز کالونی میں تو جگہ نہیں بنتی تھی، دوسرے جگہ تھی بھی نہیں، اس لیے ہمیں پراجیکٹ کے ہسپتال میں دو کمروں میں سے ایک کمرہ الاٹ کر دیا گیا تھا۔ اب اس کمرے کی پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ دو کمروں کا مشترکہ واش روم اور غسلخانہ ہمارے کمرے سے زیادہ نزدیک پڑتا تھا۔ اس لیے بعض اوقات ہمارے والے کمرے میں کافی رونق رہتی تھی۔ چونکہ ہم دونوں اسسٹنٹ جیالوجسٹ اور تیسرے خٹک صاحب (جیالوجسٹ) مختلف شفٹوں میں خدمات سرانجام دیتے تھے، اس لیے ایک وقت میں زیادہ تر ہم دو نفوس موجود ہوتے تھے۔ یہ کمرہ چونکہ مرکزی میس سے ہٹ کر تھا، اس لیے کھانا کھانے، بیڈمنٹن کھیلنے یا ٹی وی دیکھنے کے لیے ہم لوگ زیادہ وقت یا تو شفٹ میں ہوتے، چار پانچ گھنٹے ادھر نیند پوری کرتے اور زیادہ وقت میس میں ہوتے۔ ایک رات پراجیکٹ کی ایک مائن گر گئی جس کی وجہ سے کافی شہادتیں ہو گئیں۔ میں اس رات شفٹ میں تھا اور مجھے اس واقعے کا علم تھا لیکن جونئیر بٹ صاحب نہیں جانتے تھے۔ صبح صبح جب شہدا کو نہلانے لگے تو خون ملا پانی غسل خانے سے بہتا ہوا ہمارے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جونئیر بٹ صاحب جو شاید کھٹ پٹ کی آواز سے جاگ گئے تھے، اس خون ملے پانی کو کمرے میں دیکھ کر چونک اُٹھے اور بولے، ’قریشی، دیکھو یہ کیا ہے؟‘ میں

نے پھر تھوڑی سی تفصیل بتائی اور ساتھ نمازِ جنازہ کا وقت بھی بتایا تو مطمئن ہو گئے۔

اس طرح کے جان لیوا حادثات کان کنی کے شعبے میں معمول کے واقعات ہوتے ہیں، خاص طور پر کوئلے کی کان میں۔ گو کہ ادارہ کی مائنز کا پاکستان کی بہترین مائنز میں شمار کیا جاتا رہا ہے لیکن اکا دکا واقعہ میں باوجود بہترین انتظامات کے حادثات کا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک لوڈنگ مشین جو مکمل بھری ہوئی تھی، چڑھائی چڑھ رہی تھی کہ اچانک قابو سے باہر ہوئی اور برق رفتاری کے ساتھ نیچے کی طرف آنا شروع ہو گئی۔ پیچھے ایک کارکن آ رہا تھا، جس کے وہم و گمان میں بھی ایسا کچھ نہ تھا کہ 32 ٹن سے زائد سامان لیے یہ بگھی اس کو رگید کر واٹر پونڈ میں گھس گئی۔ پھر ایک اور شہادت کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ کچھ نئے تکنیک کار پراجیکٹ میں پوسٹ ہوئے اور معمول کی شفٹ میں کام کر رہے تھے۔ یہ غالباً ساؤتھ میں واقع ایک مائن کا واقعہ ہے۔ وہاں کمپریسر چل رہا تھا اور نیچے سائیٹ میں ہوا بھیجی جا رہی تھی کہ دفعتاً کمپریسر کی پائپ لائن کہیں سے ٹوٹی اور لہراتی ہوئی بے قابو ہو کر دور بیٹھے ایک تکنیک کار کے سر پر لگی جو وہاں دھوپ سینک رہا تھا۔ ضرب لگتے ہی وہ آناً فاناً واصل بہ حق ہو گیا۔

ہمارے ساتھ ایک اور ادارہ کے لوگ بھی کام کر رہے تھے۔ بے حد محنتی، جفاکش اور ہنر مند یہ لوگ ہمارے لیے ایک عدد مائن تیار کر رہے تھے۔ ان کی بھی کافی شہادتیں ہوتی تھیں۔ بلکہ انھوں نے تو وہاں شہیدوں کی ایک نشانی (چبوترہ) تیار کی ہوئی تھی۔ یہاں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ قومیں قربانی سے ہی بنتی ہیں اور

قربانی نہ دینے والی قومیں مشکل سے ہی زندہ رہ پاتی ہیں۔ اس عظیم الشان محکمہ نے اپنے اور اداروں کی طرح سخت محنت، حوصلہ مندی، لگاتار کام اور قربانیوں سے جو مقام حاصل کیا، آج قوم اسی کا ثمر کھا رہی ہے۔

اسی دوران نئے ساتھی جن میں سلطان صاحب، شاہین صاحب اور منعم صاحب وغیرہ شامل تھے، وہ بھی اسی جگہ آ گئے۔ پیچھے پیچھے ظاہر صاحب اور عبدالحفیظ تھے، وہ بھی آ گئے۔ یوں ایک تازہ بہ تازہ نیا خون اس پروگرام میں شامل ہو گیا۔

انھی شب و روز میں پتا ہی نہ چلا اور چھ مہینے گزر گئے۔ اس پراجیکٹ اور یہاں کے افسران کے ساتھ اتنا گھل مل گئے کہ یہ جگہ من کو بھا گئی۔ ہمارے دوستوں کا ایک گروپ جس میں سارے شعبہ جات کے لوگ شامل تھے، ایک خاندان کی طرح بن گیا تھا۔ ایک دوسرے کی بات اچھی طرح سمجھ آ جاتی تھی بلکہ آنکھوں کے اشارے بتا دیتے تھے کہ اگلا قدم کیا ہے۔ دن عیدین اور رات شب برات کی مانند تھی۔ کام بھی ڈٹ کر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہو رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ فرصت کے لمحات کرکٹ، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، لطیفہ گوئی غرضیکہ سارے جہاں سے اچھا یہ پراجیکٹ لگ رہا تھا کہ اچانک ایک دن میرا اور جونئیر بٹ صاحب کا اس سائیٹ سے دوسری سائیٹ کی طرف کا ٹرانسفر لیٹر آ گیا۔ اس لیٹر کا انتظار تو گزشتہ کئی ماہ سے تھا لیکن جب حقیقتاً آ گیا تو دل بھر آیا۔ بقول فیض احمد فیض، قفس میں دل لگ گیا تھا۔

بہر حال ظہیر صاحب مرحوم اور دوسرے سینئرز نے مع اپنے احباب کے ایک الوداعی تقریب کا بندوبست کیا۔ جونیئر بٹ صاحب نے پھر اختتامی خطاب اچھا کر دیا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بوجھل دل کے ساتھ سامان اُٹھایا اور نئے پراجیکٹ کی گاڑی میں سوار ہو کر ڈی جی خان مین آفس میں رپورٹ کر دی۔ یہاں ایک فیلڈ پارٹی جس نے ضلع ڈیرہ غازی خان اور ضلع راجن پور کے میں کام کرنا تھا، ہماری منتظر تھی۔ اجمل صاحب اس ٹیم کے انچارج تھے اور ٹیم میں جونیئر بٹ صاحب، مرتضیٰ صاحب اور خاکسار تھے۔ یہاں بھی سروے کا کام جاری تھا۔ سارا سارا دن سروے میں، کبھی اِدھر کبھی اُدھر، کبھی اوپر کبھی نیچے، اور رات کو ٹینٹ میں سارے دن کی تفصیلات ڈائری میں لکھ کر آرام کرنا اور اگلے دن پھر وہی روٹین۔ غرضیکہ دو یا تین ماہ کے بعد پھر واپس ڈی جی خان رپورٹ۔

انھی ایام میں کہ ہم کبھی مغرب کی طرف ہوتے تو کبھی شمالی پہاڑوں میں، ایک فیلڈ پارٹی ترتیب دی گئی جس کے انچارج جناب شیخ صاحب تھے اور اس ٹیم کا کام شمالی سائیٹ کے علاقے میں سروے کر کے مزید کامیابیاں حاصل کرنا تھا۔ اس علاقے میں جانے سے پہلے ایک جگہ آتی ہے جس کا نام گلو چوٹی ہے۔ یہاں پر ایک خالی پرائمری سکول میں ہم لوگوں نے پڑاؤ کیا اور دو تین ماہ قیام کیا۔

شیخ صاحب مرحوم نہایت جفاکش، محنتی، لائق اور ویل ڈسپلنڈ شخص تھے۔ ایک دن ہم سروے کر رہے تھے اور شومئ قسمت کہ میرے ساتھ شیخ صاحب تھے۔ ڈی جی خان میں ہیلپر کا کوئی وجود نہیں تھا۔ خود ہی برقی آلہ کو آپریٹ کرنا،

سیمپل اکٹھے کرنا اور پھر ان سیمپلز کو بڑے سے بیگ میں ڈال کر چلنا پڑتا تھا۔ کافی مشکل کام تھا لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ شیخ صاحب بھی یہ سارے کام خود کرتے تھے بلکہ ان کے آس پاس جو برقی آلہ تھا وہ ہینڈل کے بغیر تھا اور آپریٹ کرنے کے لیے اسے تین انگلیوں سے اٹھانا پڑتا تھا۔ شیخ صاحب صاحب بغیر کسی تردد کے اس برقی آلہ کو استعمال کرتے ہوئے ٹوپوشیٹ پر نشان لگاتے۔ اپنے کام میں مگن رہتے۔ ماتھے اور چہرے پر پسینہ ہی پسینہ ہوتا۔ ایک چھوٹا سا رومال ساتھ رکھتے اور بار بار چہرے کو پونچھتے۔ میرے پاس ہینڈ ہیلڈ برقی آلہ ہوتا تھا اس لیے شیخ صاحب مرحوم کی نسبت میں قدرے آسانی میں تھا۔

اس روز دوپہر کا وقت تھا، ہمیں دیکھ کر ایک مقامی آدمی بھاگا بھاگا آیا اور اپنی مخصوص مہمان نوازی کے تقاضے پورے کرتا ہوا ایک بہترین سا قالین زمین پہ بچھا دیا۔ ساتھ ہی دو تکیے بھی رکھ دیے اور بولا: ”سائیں آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میں آپ کے لیے چائے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ ہم تھکے ہوئے تو تھے ہی، اس لیے فوراً قالین پہ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گئے اور ستانے لگے۔ ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد کیتلی نما برتن میں چائے بھی آ گئی۔ یہاں کے مقامی لوگوں کے پاس چائے پینے کے لیے چھوٹے چھوٹے چینی کے کپ ہوتے ہیں۔ یہ کپ بغیر ہینڈل کے ہوتے ہیں اور ان کو تین یا چار انگلیوں کی مدد سے ایسے پکڑا جاتا ہے کہ ہاتھ نیچے اور کپ کا منہ اوپر ہوتا ہے۔ اور چائے بھی ایسے ہی پی جاتی ہے۔ ان کا ایک رواج یہ بھی ہے کہ میزبان اس وقت تک چائے اس کپ میں انڈیلتا رہے گا جب تک مہمان کپ

کو اُلٹا نہیں رکھ دیتا۔ ورنہ میزبان چائے انڈیلتا رہے گا اور مہمان کو پینا پڑے گی۔ چنانچہ میں چائے پیتا رہا اور میرا میزبان اس کپ کو بار بار بھرتا رہا۔ میری بھوک اور پیاس اچھی طرح سَیر ہو رہے تھے۔ مزا الگ آرہا تھا۔ جوانی کی بھوک و پیاس اور سَیر ہونا ایک الگ ہی دنیا کی بات ہے۔ شیخ صاحب ایک دو کپ پی کر فارغ بیٹھے تھے اور میرے انتظار میں تھے کہ کب میں چائے پینے سے فارغ ہوتا ہوں تاکہ دوبارہ سفر شروع کیا جائے۔ ایک میں تھا کہ کپ کو الٹا ہی نہیں رہا تھا۔ سات یا آٹھ کپ ہوئے تو شیخ صاحب مرحوم کا ضبط جواب دے گیا اور وہ یکدم اپنی عادت کے مطابق تیزی میں آگئے اور اس میزبان کو بولے، "اس طرح کرو کہ باقی کی چائے اس صاحب کے سَر پر انڈیل دو۔" میں شفیق مرحوم کی بات کو سمجھ گیا اور فٹافٹ کپ کو اُلٹا کر دیا اور کپڑے جھاڑ کر اٹھ کر بولا، "آؤ سر جی، چلیں۔"

میزبان کا شکریہ ادا کیا اور دعاؤں کے ساتھ رخصت ہوئے۔ سروے کرتے ہوئے ہم لوگ مغربی سائیٹ پر واقع ایک کیمپ کے قریب پہنچ گئے۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ پاؤں بھی من من کے ہو رہے تھے۔ خیال تھا کہ یہیں سے واپس کیمپ جایا جائے کہ شیخ صاحب نے کہا کہ آج کی رات ہم اسی کیمپ میں گزاریں گے، جس کے انچارج جناب اجمل صاحب تھے۔

سروے کرتے کرتے تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے اور شیخ صاحب کی بات سونے پر سہاگہ کہ ابھی مزید چار پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ وہ بھی سِن کلائن کے مغربی حصے کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف جانا تھا۔ راستہ دشوار و

ناہموار تھا اور بھوک پیاس سے نڈھال، تھکاوٹ سے چُور بدن تھے۔ بڑی مشکل سے رات کے نو بجے کیمپ میں پہنچے۔ ہم میس میں پہنچتے ہی تقریباً گر پڑے۔ اُدھر سے اجمل صاحب نمودار ہوئے۔ ماتھے پہ شکن، منہ لال سرخ اور گھن گرج آواز میں دریافت کیا، 'یہ آنے کا وقت ہے اور کوئی اطلاع بھی نہیں؟ اب کھانا بھی ختم ہو گیا ہے۔ مزید برآں میں باورچی کو کہہ بھی نہیں سکتا کہ تمھارے لیے کوئی بندوبست کرے۔ وہ بھی آخر انسان ہے۔' ایک ہی سانس میں اجمل صاحب نے اگلے پچھلے تمام حساب برابر کرنے کی کوشش کی۔ یہ میں جانتا تھا کہ کہہ تو مجھے رہے ہیں، دراصل سُنا شیخ صاحب کو رہے ہیں، کیونکہ شیخ صاحب سے ان کی بنتی نہیں تھی۔ اور آج اجمل صاحب حالانکہ رینک میں جونیئر تھے لیکن ہاتھ آیا موقع ضائع نہیں کر رہے تھے۔ اِدھر سے شیخ صاحب بھی کوئی آسان نشانہ نہ تھے، دونوں کی کافی لفاظی لڑائی کے بعد جب شیخ صاحب صاحب کا پلڑا بھاری پڑنے لگا تو اجمل صاحب نے اعلان کیا کہ 'جو روکھی سوکھی روٹی پڑی ہے وہ آپ کھالیں، لیکن اس کے پیسے ابھی کے ابھی ادا کریں۔ مزید براں صبح کے ناشتے کے پیسے بھی پیشگی ادا کریں۔' اجمل صاحب کا یہ ہتھیار بہت خوفناک تھا اور ساتھ ہی ٹنگسٹن کاربائیڈ ٹائپ سٹینڈ۔ بڑی منت سماجت کے بعد رات کا کھانا اور بستر حاصل کیا اور صبح صبح ناشتہ کر کے پیسے باورچی کے حوالے کر کے ہم واپس گلوچوٹی کی طرف روانہ ہوئے۔

کچھ ہفتوں بعد جب اس سِن کلائن کی مشرقی رینج کو مکمل کر لیا اور کچھ حصہ مغربی مکمل کیا تو نزدیک ہی ایک ٹیرس پر اپنے خیمے گاڑ لیے۔ یہاں پر ہمارے ساتھ

خٹک صاحب کا ساتھ بھی تھا۔ طے یہ ہوا کہ موجودہ لوکیشن سے شمال کی طرف سوری ندی تک دیکھا جائے اور مزید کامیابیاں حاصل کی جائیں۔

اس وقت تک سردیاں گزر چکی تھیں اور موسمِ بہار کی آمد آمد تھی۔ بے شک موسم خوشگوار تھا لیکن دوپہر کا وقت اور پہاڑ پر چلنا کافی گرم گرم ہوتا تھا۔ ایک دن میں اور جونئیر بٹ صاحب ایک ساتھ سروے کر رہے تھے اور بغل چُر سے کافی آگے نکل گئے تھے۔ گرمی بڑھ رہی تھی اور سختی محسوس ہو رہی تھی۔ جب میری اور جونئیر بٹ صاحب کی کام کے سلسلے میں کوئی بات ہوئی اور چونکہ جونئیر صاحب نے پہلے اتنا تھکا دینے والا سروے نہیں کیا تھا، اس لیے ان کی طبیعت میں کچھ کچھ تناؤ پیدا ہوا جو بڑھتے بڑھتے غصہ کے لیول تک آ گیا۔ کہنے لگے، 'چلو آج کے لیے اتنا کام کافی ہے۔ واپس چلیں۔' میں نے کہا، 'بٹ صاحب ابھی تو کام شروع ہوا ہے۔ آج ہم نے سوری ندی تک جانا ہے۔ اس لیے ذرا قدم بڑھائیں اور جلدی بڑھائیں۔' جونئیر بٹ صاحب ایک دم طیش میں آ گئے۔ برقی آلہ کو اِدھر پھینکا اور برٹن کو اُدھر، اور بولے، 'جاؤ شیخ صاحب کو بتا دو، میں اس سے آگے ایک قدم نہیں جاؤں گا۔' یہ کہنا تھا کہ مڑے اور سیدھا کیمپ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ بہر حال میں نے اپنا کام بھی مکمل کیا اور سارا سامان اٹھا کر واپس شام کے وقت کیمپ پہنچا۔ کیمپ پہنچ کر معلوم ہوا کہ جونئیر بٹ صاحب کو بخار ہو گیا ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ فیلڈ میں بٹ صاحب چڑ چڑے ہو رہے تھے۔

اگلے دن میں اور خٹک صاحب اکٹھے فیلڈ پر گئے اور اپنا اپنا رُوٹ طے کرنے

کے بعد اکیلے اکیلے روانہ ہو گئے۔ یہاں بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ جب میں خٹک صاحب سے جدا ہوا تو اپنے اور خٹک صاحب کے درمیان 300 میٹر فاصلہ رکھ کر سروے کرنا شروع کر دیا۔ سروے کرتے کرتے ایک جگہ درختوں کا جھنڈ نظر آیا تو کچھ دیر استراحت کی غرض سے اس طرف چل دیا۔ یہاں زیادہ تر بیری کے بہت گھنے درخت تھے، جن کی چھاؤں کی وجہ سے بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ میں وہاں پر موجود ایک تنگ سی جگہ سے گزر رہا تھا کہ اچانک چھن کی آواز آئی اور ایک مقامی لڑکی جس کے ہاتھ میں چھری تھی، جو غالباً اپنے ریوڑ کو چرانے لے کر آئی ہوئی تھی، چھلانگ لگا کر میرے دوبدو ہوئی اور مقامی زبان میں پوچھا، 'آپ کہاں جا رہے ہو؟' پہلے پہل تو میرے ہوش اور بہادری رخصت ہوئے پھر انجانے سے خوف نے گھیر لیا کہ یہ افتاد کہاں سے آن پہنچی۔ دل بے حد گھبرایا۔ منہ سے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے جن کا مفہوم یہ تھا کہ میں آگے جا رہا ہوں۔ الفاظ کی ادائیگی اتنی کمزور تھی کہ مجھے اپنی ہی آواز کسی گہرے کنویں میں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ چشمِ زدن میں لگا جیسے یہ کوئی چڑیل ہے۔ ڈر کے مارے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور نظریں ملائے بغیر وہاں سے نکلنے میں ہی عافیت سمجھی۔

ابھی اس جھنڈ میں ہی تھا کہ پانچ سات بچے سامنے آئے اور آتے ہی کسی نے میری پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، کوئی بر ٹن والی بیلٹ کھولنے لگا اور کوئی برقی آلہ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ پہلے پہلے تو میں انھیں مقامی بچے ہی سمجھا اور پہلے جس لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی، اس کے ساتھی، لیکن جیسے ہی غور کیا تو جھٹکا سا لگا۔ کہ ایک تو

وہ سارے بچے ایک ہی قد کے تھے اور سارے ہی ننگ دھڑنگ اور تیسرا یہ کہ سبھی گنجے تھے۔ بس پھر کیا تھا، ذہن فوراً شتونگڑوں کی طرف گیا اور دماغ نے مان بھی لیا کہ یہ غیر مرئی مخلوق ہیں اور پہلے بھی جو لڑکی ٹکرائی تھی، وہ بھی اسی مخلوق کی رشتہ دار تھی۔ جیسے ہی یہ خیال پختہ ہوا، میں نے لوہے والا ہتھوڑا مضبوطی سے تھام لیا اور چیختے ہوئے ان کی طرف لہرایا۔ ادھر سے میں چیخا اور ادھر سے وہ سارے چیخے اور ہم مخالف سمتوں میں بھاگے۔ پہلے پہل تو خوف کے مارے ٹانگیں سُن ہو گئیں، من من کی لگنے لگیں، بھاگا تک نہ جا رہا تھا، پھر ہمت کر کے آیتہ الکرسی کا ورد کرتے کرتے جو بھاگنا شروع کیا تو بھاگتا ہی چلا گیا اور کم از کم ایک کلومیٹر کے بعد جا کر رُکا۔ اسی اثنا میں خٹک صاحب بھی آ ملے۔ مجھے گھبرایا ہوا دیکھ کر صورتِ احوال سے آگاہی چاہی۔ میں نے مصنوعی بہادری سے پوچھا، 'آپ کہاں رہ گئے تھے؟ میں نے اتنی آوازیں دیں لیکن آپ کا کچھ پتا ہی نہیں۔' اور میں خود بھی شرمندہ ہو گیا۔ مزید کوئی بات نہ ہوئی اور ہم دونوں کیمپ لوٹ آئے۔

کچھ عرصے بعد ہمارا کیمپ ایک دوسرے ٹیرس پہ شفٹ ہو گیا۔ اس کیمپ کا ایک ہی خاص واقعہ ہے کہ شیخ صاحب مرحوم کے ساتھ مقامی لوگوں کا جھگڑا ہو گیا۔ بات بڑھتے بڑھتے قریب تھا کہ ہاتھا پائی کی طرف جاتی، میں نے شیخ صاحب صاحب کی سائیڈ لیتے ہوئے مقامی لوگوں کے ساتھ انھی کی طرح جارحانہ رویہ اپنا لیا۔ شیخ صاحب مرحوم بھی شیر ہو گئے اور معاملہ عزت کے ساتھ رفع دفع ہو گیا۔

ڈگر کیمپ میں:

موسم کے بدلتے ہی سروے کیمپ ایکسپلوریشن کیمپ میں تبدیل ہوا اور ہم لوگ ڈگر ٹیرس پر شفٹ ہو گئے۔ یہاں کم و بیش 20 کے قریب خیمے تھے اور اجمل صاحب کیمپ انچارج۔ میں بھی حالات کو کافی حد تک بھانپ چکا تھا اور ایک قسم کا کیمپ کے معاملات کا رازدار بن چکا تھا۔ بطور میس مینیجر ہر ایک افسر کی ڈیوٹی ہر ماہ تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ شومیِ قسمت کہ جب میری باری آئی تو اوپر تلے میس میں سبزیاں پکنا شروع ہو گئیں۔ اجمل صاحب آہستہ آہستہ بگڑنے لگے کہ لگاتار سبزیاں پک رہی ہیں، گوشت وغیرہ کیوں نہیں۔ اب آٹھ دس افسران کا میس تھا اور اجمل صاحب کے علاوہ دوسرا کوئی افسر اعتراض نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے میں نے بھی کوئی خاص پروانہ کی اور دال سبزی چلتی رہی۔ اسی دوران اجمل صاحب نے 7up بوتل کا ایک کریٹ ڈی جی خان سے منگوالیا اور اپنے لیے کچھ پھل بھی۔ کھانا کھانے کے بعد اجمل صاحب ایک بوتل کھولتے اور مزے مزے سے نوش فرماتے۔ میں نے چونکہ اس معاملے کو زیادہ خاطر میں نہ لیا تھا اس لیے بے تکلفی سے اجمل صاحب کو کہا کہ ایک بوتل مجھے بھی پینے کو دیں۔ وہ شاید اسی انتظار میں تھے کہ میں اسے کسی طرح بھرپور جواب دوں۔ اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ بڑے سوچ کر اور رعونت سے بولے، ”ہوں، کھانے ٹینڈے اور پینی بوتل۔ چل چل، چُپ کر کے بیٹھ۔“ ایسا سخت جواب سن کے جی تو بہت تلملایا لیکن میں ضبط کر گیا اور بات کو مذاق میں ٹال دیا۔ پھر کئی دنوں تک یہ بات ایک ضرب المثل کے طور پر کیمپ میں گھومتی رہی۔

بالآخر صلح صفائی ہوئی اور یہ طے ہوا کہ دیسی مرغی پکے گی تو بوتل ملے گی۔

ایک سینئر آفیسر کی شہادت:

اسی کیمپ کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک دن جناب ڈار صاحب تشریف لائے۔ یہ مجھ سے سینئر تھے اور اپنی کاوش کی وجہ سے ذیلی ادارہ لاہور میں ٹرانسفر ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ان سے دوستی بہت گہری تھی، چونکہ لاہور کے رہائشی بھی تھے۔ ڈار صاحب اپنی سرکاری ذمہ داری میں بہترین اور اپنی فیلڈ کے ماسٹر تھے۔ رات کو کھلے آسمان تلے چارپائیاں بچھتی تھیں اور جنریٹر نامی نعمت یہاں پر بھی ندارد، اس لیے قدرت کے پنکھے کا انتظار کرتے اور باتیں کرتے کرتے نیند کی وادی میں چلے جاتے۔

اسی طرح اپنی اپنی چارپائی پہ لیٹے باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک ڈار صاحب کہنے لگے، 'مقامی لوگوں کے ایک سردار نے ایک جگہ جلسہ میں تقریر کی ہے اور لوگوں کو اکسایا ہے کہ ادارہ کی انتظامیہ اگر تمھاری بات نہیں مانتی تو ان کا ایک آدھ آفیسر پھڑکا دو۔ لہٰذا خیال سے رہو اور مقامی لوگوں سے کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہ کرو۔' یہ بات ڈار صاحب نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہی تھی جو چند ہفتے قبل ہمارے ساتھ مقامی لوگوں کے جھگڑے کا تھا۔ اس میں بھی مقامی لوگ بہت اشتعال میں آ گئے تھے اور اسلحہ کے استعمال کی نوبت آ گئی تھی۔ بہر حال ڈار صاحب کی اس بات کا اگلے دن جو جواب آیا، اس نے ہم سب کو دہلا دیا۔ چونکہ ڈار صاحب کی

ٹرانسفر ڈی جی خان سے لاہور ہو گئی تھی اور وہ الوداعی ملاقات کے لیے ایکسپلوریشن کیمپ میں آئے تھے، انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ کیوں نہ ادارہ کے دوسرے افسران کو بھی مل جاؤں کہ بعد میں شاید یہ موقع نہ ملے۔ چنانچہ ہم سب بڑے کیمپ کی جانب چل دیے۔ وہاں جا کر علم ہوا کہ آج چونکہ یعقوب صاحب مینیجر کیمپ نے ویک اینڈ پر ڈی جی خان جانا ہے اس لیے دوسری سائیٹ کے وزٹ پر ہیں۔ خیر ہم سب وہاں چلے گئے اور ملک صاحب، ارشد صاحب اور دوسرے صاحبان سے ملے۔ یعقوب صاحب چھ فٹ سے زائد قد کے مضبوط جسم اور متاثر کُن شخصیت کے مالک تھے اور رعب و دبدبہ میں علوی مرحوم سے کم نہ تھے۔ بڑے تپاک سے ملے، خاص طور پر ڈار صاحب کو، اور کہنے لگے، 'میں تو سیدھا یہیں سے ڈی جی خان جاؤں گا، اگر آپ کچھ دیر پہلے آجاتے تو آپ کی کوئی خدمت کرتے۔' بہر حال ہم لوگ بھی یہیں سے ملاقات کر کے پلٹے اور اپنے کیمپ میں پہنچ گئے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا اور عصر کی نماز پڑھ کے کرکٹ کھیلنے کی تیاریوں میں تھے کہ فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ آوازوں کو معمول کی مقامی لوگوں کی کارروائی سمجھا اور کرکٹ میں مشغول ہو گئے۔ اسی اثناء میں انور مرحوم اور دوسرے لوگ بھاگتے ہوئے ہماری سمت آئے۔ سخت بوکھلائے ہوئے اور سانس پھولی ہوئی۔ گرتے پڑتے قریب آکر بولے، 'یعقوب صاحب مینیجر کیمپ کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی ہے اور لگتا ہے جیسے یعقوب صاحب کی شہادت ہو گئی ہے۔' یہ سننا تھا کہ دھیان فوراً ڈار صاحب کی رات والی بات پر چلا گیا۔ بیک وقت ہم سب کی زبان

سے نکلا کہ واقعی وہ والی بات حقیقت ثابت ہو گئی کہ 'ایک آدھ افسر پھڑکا دو۔' اب صورتِ حال یہ تھی کہ رات والی بات کے سچ ہونے کا ثبوت اور مقامی لوگوں کے ساتھ چند ہفتے پہلے ہونے والی لڑائی، ان تمام باتوں نے ڈر اور خوف کی فضا پیدا کر دی، ایسے لگا جیسے اب ہماری باری ہے، لہٰذا یہاں سے فرار حاصل کیا جائے اور سیدھے ڈی۔جی خان آفس رپورٹ کی جائے۔ اب چونکنے کی بات یہ بھی تھی کہ اسی گاڑی میں اعجاز صاحب اور ایک اور اکاؤنٹس آفیسر بھی تھا، جو یعقوب صاحب کے ساتھ ہی ڈی۔جی خان جا رہے تھے۔ اس بات کو ذہن میں لانا تھا کہ چشمِ زدن میں لگا جیسے خدانخواستہ وہ بھی کہیں شہید نہ ہو گئے ہوں۔ بہر حال گاڑی نکالی اور ڈار صاحب کہنے لگے کہ گاڑی میں چلاتا ہوں۔ ساتھ اجمل صاحب اور میں بیٹھ گئے۔ مشتاق صاحب (ٹی-او) کو کیمپ میں ہی چھوڑا کیوں کہ چند ہفتے پہلے مقامی لوگوں سے جو جھگڑا ہوا تھا، اس میں مشتاق صاحب موجود نہ تھے جبکہ ہم جو گاڑی میں بیٹھے، سب کے سب اس جھگڑے میں شامل تھے۔ اس لیے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں مقامی لوگ جتھے کی شکل میں آئیں اور ہم لوگوں کو جسمانی نقصان پہنچائیں۔ بہر حال سراسیمگی تو پھیلی ہی تھی، اس لیے کیمپ سے سیدھا حادثے والی جگہ جانے کی بجائے ہم نے گاڑی ڈی۔جی خان کی طرف موڑ لی۔ راستے میں ایک ویگن ملی جس میں عابد صاحب مرحوم اور دوسرے ایڈمن کے لوگ تھے اور ان کو بھی یعقوب صاحب کی شہادت کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ صورتِ حال کا اندازہ کرنے کے لیے مین کیمپ جا رہے تھے۔ انھی کی زبانی کچھ تفصیلات ملیں کہ ایک شخص نے یعقوب صاحب کی گاڑی پر اندھا دھند

فائرنگ کی جس کی وجہ سے یعقوب صاحب اور ان کا ڈرائیور موقع پر ہی شہید ہو گئے جبکہ اعجاز صاحب اور اکاؤنٹ آفیسر اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ تمام تفصیلات سن تو رہے تھے لیکن رات کو جو بات ڈار صاحب نے سنائی تھی، صرف وہی ہمارے ذہن پر سوار تھی اور باقی قاتل کی یا اور جو بھی خبریں تھیں، ساری کی ساری اسی تناظر میں ملی جلی محسوس ہوتی تھیں کہ 'ایک آدھ افسر پھڑکا دیں۔'

بہر حال جیسے تیسے ڈی جی خان پہنچے، وہاں ایک دردناک اور سوگ والی کیفیت تھی۔ ہمیں لوگوں نے گھیر لیا اور حادثہ کی تفصیل پوچھنا چاہی لیکن ہم نے بتایا کہ ہم حادثے والی جگہ پر نہیں گئے اور ہمیں بھی اتنا ہی علم ہے جتنا آپ لوگوں کو۔

یعقوب صاحب کی شہادت 21 ستمبر کا واقعہ ہے اور میری شادی 6 اکتوبر کو ہونا قرار پائی تھی۔ وہ شادی کارڈ جو میں نے یعقوب صاحب کو دعوت دینے کے لیے لکھا تھا، ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ جب بھی اس پر نظر پڑتی ہے دل عجیب سا غمگین ہو جاتا ہے۔

اگلا دن یعقوب صاحب جیسا شیر، ڈیڈ باڈی میں تبدیل ہو کر سول ہسپتال ڈی جی خان کی ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ اوپر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور وہ شیر جس کے سامنے تو درکنار پیچھے سے جانے کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی، ایک کونے میں بچھی چارپائی پر پڑا تھا اور لوگ اِدھر اُدھر بے پروائی سے آ جا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ یعقوب صاحب ہمارے ہیرو تھے۔ بے شک ہم ان سے بات کرتے

ہوئے سہمتے تھے لیکن وہ آٹھ نو سو ملازمین جو بڑے کیمپ میں کام کرتے تھے، ان کا ایک مضبوط سہارا تھے۔ لوگ واقعی ان کو ایک طاقت ور رہبر کے طور پر مانتے تھے۔ مگر کیا ہو سکتا ہے، ہر ایک ذی روح نے موت کا مزا چکھنا ہے اور یہی قدرت کا اٹل قانون ہے۔ زندگی کی کوئی ضمانت نہیں لیکن موت کی ہے۔

اپنی نوعیت کا پہلا اور دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آتے ہی فوری طور پر تمام پراجیکٹ اور کیمپس کے سارے عمل ساقط ہو گئے۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ ڈی جی خان پہنچ گئے۔ ضروری قانونی تقاضے پورے ہونے کے بعد اگلے دن نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور میت کو مرحوم کے شہر لے جانے کے لیے سرکاری سواری کا بندوبست کیا گیا۔

ہم سب لوگ بشمول منیر صاحب، ارشد صاحب، اجمل صاحب، سلطان صاحب سارے صاحبان یعقوب صاحب شہید کی میت کو انکے آبائی شہر سپردِ خاک کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں ایک مردِ بہادر جو مقامی تھا، اوراس کا نام شیر خان تھا، اس کی انسان دوستی اور ایمان پروری کا ذکر نہ کیا جائے تو بدترین ناانصافی ہو گی۔ شیر خان چونکہ مقامی تھا اور محکمہ کے ملازمین میں مقامی لوگ کسی حد تک مشکوک ہو گئے تھے، اس لیے جب شیر خان نے کہا کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ یعقوب صاحب کی میت کو سپرد خاک کرنے جاؤں گا' تو ہم سب لوگ ششدر رہ گئے۔ اس کو کافی سمجھایا کہ ملازمین میں غم و غصہ پایا جاتا ہے، کہیں یہ نہ ہو کہ تمھیں زبانی یا جسمانی طور پر کوئی نقصان پہنچے۔ یہ سن کر وہ مرد کا بچہ بولا کہ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ ان

شاء اللہ مجھے آپ سب پر اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے۔ پانچوں انگلیوں میں فرق ہوتا ہے۔ ایک بے وقوف کے بے وقوفانہ عمل کی وجہ سے ساری کمیونٹی کو خراب نہیں سمجھنا چاہیے۔ بہر حال شیر خان ہمارے ساتھ مرحوم کے آبائی شہر تک تدفین کے لیے گیا اور جب تک یعقوب صاحب شہید کے جسدِ خاکی کو لحد میں اتارا گیا، وہ ہمارے ساتھ ہی رہا۔ کفن دفن کے بعد ہم سب قدرتی طور پر کسی حد تک نارمل ہوئے اور رات شہر میں انجم صاحب کے کسی جاننے والے کے گھر گزارنے کے بعد اگلی صبح ڈی جی خان کے لیے روانہ ہوئے۔

دو دن اور ایک رات کی تھکاوٹ تھی، تقریباً سوتے ہوئے ہی ڈی جی خان پہنچے۔ ابھی مین گیٹ میں ہی تھے کہ اطلاع ملی، جناب سلطان صاحب کی والدہ پشاور میں رحلت فرما گئی ہیں۔ بے چارے سلطان صاحب دو تین دنوں سے ہمارے ساتھ انتہائی تھکا دینے والے سفر میں تھے۔ اس اندوہ ناک خبر کو سن کر کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہیں سے فوراً پشاور روانہ ہو گئے۔

اب تمام فیلڈ کیمپ ڈی جی خان منتقل ہو گئے تھے اور مقامی انتظامیہ ہیڈ کوارٹرز کی انتظامیہ اور ڈی جی خان قبائلی علاقے میں متعین امن و امان کو برقرار رکھنے والوں کے مذاکرات شروع ہو گئے تھے۔ اور چونکہ میری شادی کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی، چنانچہ میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے لیے لاہور چلا آیا۔

شادی کرنے کے بعد واپس ڈی جی خان پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی مذاکرات چل رہے ہیں اور ادارہ نے کچھ مطالبات رکھے ہیں جس میں سیکیورٹی کا مطالبہ سرِ فہرست

ہے۔ بہر حال مارچ 1990 تک سارے معاملات طے پا گئے اور نئے مینیجر جناب ظہیر صاحب کی زیرِ قیادت کام ایک دفعہ پھر شروع ہو گیا۔ ادھر ایکسپلوریشن سائیٹس میں بھی سکیورٹی کے جوان متعین کر دیے گئے اور تقریباً سات آٹھ ماہ بعد کام مکمل طور پر شروع ہو گیا۔

ایام گزرتے دیر نہیں لگتی۔ 4 جولائی 1990 کو اللہ تعالیٰ نے حفصہ کی شکل میں بے شمار رحمتوں اور نعمتوں سے نوازا۔ میں باپ بن گیا۔ محسوسات یکلخت بدل گئے۔ کھلنڈرا پن غائب، احساسِ ذمہ داری رگ و جاں میں جاری و ساری۔ حفصہ بروز عید الاضحیٰ دنیا میں آئی۔ میری والدہ ماجدہ نے نام رکھا۔ دوسرے تیسرے دن ہاسپٹل سے گھر لے کر آیا۔ زندگی کی پاکیزہ رونقیں ہر طرف جگمگا رہی تھیں۔ اس کو اپنے ہاتھوں میں اُٹھاتا اور دیکھتا ہی جاتا۔ اللہ کا شکر ادا کرتا جس نے یہ سب کچھ بخشا۔

دوبارہ سروے کیمپ ڈگر میں:

اب کام کی رفتار تو اچھی ہو چکی تھی لیکن پہلے والی بات نہ تھی۔ ایک انجانا ڈر اور خوف اور ذہنی پریشانی ہر وقت ساتھ رہتی تھی۔ دوسرا مقامی لوگوں سے کھنچ کر رہنا پڑتا تھا۔ لیکن وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ آہستہ آہستہ زخم بھر جاتے ہیں اور تلخیاں محبتوں میں بدل جاتی ہیں۔ اس واقعے کے بعد سروے کیمپ جہاں سے بند ہوا تھا، وہیں سے پھر شروع ہو گیا اور کچھ عرصہ کے بعد ڈگر میدان میں منتقل ہو گیا۔ جناب خان صاحب اور بھائی جان ہمارے کیمپ کے سینئر افسران تھے۔ شیخ صاحب مرحوم

نئے مینیجر بن گئے اور رانا صاحب کی کچھ عرصہ بعد محکمہ کے ایک ذیلی ادارہ لاہور میں منتقلی ہو گئی۔ منظر نامہ کافی حد تک بدل گیا۔

ایک دن شیر خان نے ہمارے کیمپ کی دعوت کی اور بکرے کی سجی تیار کی۔ ہم لوگ مقررہ وقت پر اس کی دعوت گاہ پر پہنچ گئے۔ پہلے پہل شیر خان نے ہم لوگوں کو شہد کا شربت پلایا جو ہم نے سَیر ہو کر نوش کیا۔ اس کے بعد بڑا بے تکلف کھانا چُنا گیا جس میں مرغی اور بکرے کا قورمہ اور گرما گرم روٹیاں تھیں۔ بعد ازاں سجی دستر خوان پر آئی۔ جوانی کے ایام تھے اور میزبان بھی تگڑا تھا۔ میرے، خان صاحب کے بھائی جان اور الطاف حسین صاحب کے سامنے ہمارے ڈرلرز جوان تھے اور ادھر ہم افسران، ڈرلر جوانوں میں اصغر، عبدالقیوم، عرفان، مجید صاحبان تھے۔ نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو تولا اور چیلنج کر دیا کہ یہ جو سامنے سجی کی رانیں پڑی ہیں، یہ کھانی ہیں اور ساری کی ساری کھانی ہیں۔ بلکہ کھانے کا حق ادا کر دینا ہے۔ لہٰذا مقابلہ شروع ہو گیا۔

میرے دائیں جانب جناب خان صاحب اور بائیں جانب بھائی جان تھے۔ میں نے کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا اور ساتھ شہد ملا پانی بھی پیا۔ مرغی اور بکرے کا سالن بھی کھایا اور اب سجی کے ساتھ دو دو ہاتھ کر رہا تھا کہ میرے دائیں اور بائیں بیٹھے دونوں افسران نے اپنا آدھا آدھا حصہ کھایا اور باقی میرے سامنے انڈیل دیا۔ ادھر اصغر نظروں ہی نظروں میں مجھے تول رہا تھا اور چیلنج کر رہا تھا۔ میں کافی اوور سمارٹ ہو گیا اور اپنے حصے کی پوری ران ختم کرنے کے بعد خان صاحب اور بھائی

جان، دونوں کی چھوڑی ہوئی رانیں بھی کھا گیا۔ مقابلے کی فضا بنی ہوئی تھی اور میں آخر تک کھاتا رہا۔ اصغر ہنس کر پیچھے ہٹ گیا جیسے بظاہر اپنی ہار مان لی اور مجھے فاتح مان لیا۔

خیر، ہم وہاں سے اُٹھے اور کیمپ واپس آئے۔ اس دوران تو کچھ نہ ہوا لیکن عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد جب سبھی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا اور معدہ میں جب گوشت ہضم ہونے کے لیے کروٹیں بدلنے لگا تو یقین ہو گیا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ رات کے 9 بجے یہ گڑبڑ شروع ہوئی اور گوشت معدے میں گھوم کر اوپر منہ کی طرف آئے، پھر واپس چلا جائے۔ گوشت ہضم ہو رہا تھا اور چونکہ زیادہ کھا لیا تھا، اس لیے معدے سے حلق کی طرف سفر طے کر رہا تھا۔ اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ ابکائی آئی کہ آئی۔ میں شاید حلق میں انگلی ڈال دیتا اور سارا گوشت باہر نکال دیتا لیکن بھائی جان آڑے آ گئے۔ کہنے لگے، 'کھانا تو کوئی بڑی بات نہیں، اس کو ہضم کرنا اور معدے میں محفوظ رکھنا یعنی پچانا ہی اصل بات ہے۔' لو جی، ایک اور چیلنج۔ میں نے پورے کیمپ کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر، لیکن معدے اور حلق کے درمیان میں گوشت کے جھٹکے تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ بلکہ اب ان کی شدت میں تیزی آ رہی تھی۔ اپنا سر اوپر اٹھائے گوشت کو ہاضمے والے عمل میں دوچار کیے مجھے خیال آیا کہ کوئی ایسا مکسچر یا سوڈا منٹ کی گولیاں مل جائیں جو کھاؤں، یا ہاجمولا جیسی کوئی ہربل چیز جس سے ڈکار آئے اور یہ گوشت ہضم ہو۔ لیکن کیمپ میں ان میں سے کوئی بھی مددگار دوا میسّر نہ ہوئی۔ حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

ڈکار بند اور رتے بس آیا ہی چاہتی تھی کہ نیچے ڈگر مائن کے دروازے پر لائٹ جلتی ہوئی نظر آئی۔ ٹیرس سے اس کی گہرائی کوئی سوڈیڑھ سوفٹ ہو گی۔ فوراً خیال آیا کہ وہ جو نیچے لائٹ جلی ہوئی ہے، ممکن ہے وہاں ڈسپنسر موجود ہو اور اس کے پاس اس مصیبت کا علاج ہو جو میں نے خود ہی پالی تھی۔ چنانچہ ٹیرس سے نیچے کی طرف ڈگر مائن کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ادھر معدہ تھا کہ مکمل ناراض، چشمِ زدن میں لگا کہ کہہ رہا ہو، 'میں ابھی کے ابھی تمام میٹیریل واپس بھیجتا ہوں۔' میں بھی جی کڑا کر کے چلتا رہا اور جیسے ہی مائن آفس پہنچا، خوش قسمتی سے ڈسپنسر کو وہاں موجود پایا۔ جلدی جلدی مدعا بیان کیا، وہ تجربہ کار تھا، سمجھ گیا کہ ظالم قسم کی بدہضمی کا معاملہ ہے۔ فوراً سوڈامنٹ کی گولیاں نکالیں اور مجھے پانی کے ساتھ کھانے کو دیں۔ آناً فاناً گولیاں پیٹ میں انڈیلیں، پانی پیا اور واپس ٹیرس کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

اللہ نے بے حد مہربانی فرمائی، ایک دو ڈکار آئے، سانس میں سانس آنا شروع ہوا۔ رگوں میں خون جو بے حد سُست ہو چلا تھا، رواں ہونا شروع ہو گیا اور کچھ جان میں جان آئی۔ اسی تگ و دو میں رات کے دو بج گئے۔ چارپائی پر لیٹا لیکن ڈر خوف کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ صبح مؤذن نے اذان دی تو اُٹھا۔ وضو کیا، نماز پڑھی اور اس کے بعد سو گیا۔ یوں یہ آفت والی رات اختتام پذیر ہوئی۔ صبح جس جس کو بھی اس واقعے کا علم ہوا، اس نے اپنے اپنے انداز میں خوب لے دے کی اور مزے لیے۔

اس واقعے سے ایک بہت بڑا سبق یہ ملا کہ اپنی بساط سے بڑھ کر ٹانگیں نہیں پھیلانی چاہییں اور ہر معاملے میں اعتدال کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

ٹینٹ لائف میں جہاں اور صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی تھیں، وہاں قدرتی آفات سے بچاؤ نہایت کٹھن ہوتا تھا۔ خاص طور پر طوفانی ہواؤں اور بارشوں سے محفوظ رہنا بعض اوقات تو ناممکن ہو جاتا تھا۔ طوفانی بارشیں خیموں کے لیے بسا اوقات قہرِ خداوندی کی صورت میں نازل ہوتیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ڈگر کے نزدیک ایک ٹیرس سے متعلق ہے جہاں افسران اور سٹاف ممبران کے ملا جلا کر کوئی چالیس کے قریب خیمے نصب تھے اور بالکل کھلے آسمان کے نیچے۔ ان خیموں کو کسی بھی طرف سے کوئی حفاظتی دیوار یا پہاڑ کی اوٹ میسر نہ تھی۔ اس لیے اگر ہوا کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تو خیمے پھڑ پھڑاتے اور اگر مضبوطی سے نہ بندھے ہوتے تو گر جاتے۔ اس ہوا کی شدت میں اگر بارش بھی شامل ہو جاتی تو یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو جاتا۔ خیمے کے اندر والے بانس کو اچھی طرح پکڑنا پڑتا کیونکہ اگر یہ اکھڑ جاتا تو پھر باقی خیمے کو بچانا تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ اسی طرح کا ایک شدید طوفانِ باد و باراں کا سامنا ہوا۔ اس طوفان نے دیکھتے ہی دیکھتے آدھے سے زیادہ خیمے گرا دیے۔ جن کے مکین اندر تھے انھوں نے تھوڑی بہت مزاحمت کی لیکن کامیابی ندارد۔ آخر خیمے پھٹ گئے اور ہواؤں کے دوش پر اُڑنے لگے۔ خیمے میں پڑی اشیاء مثلاً لوہے کی بالٹیاں، کپڑوں کے صندوق، چارپائیاں اور بستر وغیرہ اس طرح ہوا میں اُڑنے لگے جیسے زمینی کشش سے آزاد ہو گئے ہوں۔ اتنے میں اندھیرا بڑھنا شروع ہو گیا۔ تیز طوفانی بارش میں درجہ حرارت میں کافی کمی آ گئی اور ٹھنڈ بھی زیادہ لگنا شروع ہو گئی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد طوفان تھما اور ہم سب لوگ اکٹھے ہوئے تو دیکھا

تقریباً سارے ہی خیمے پھٹ کر چیتھڑوں میں بدل کر ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اندر سے بالٹیاں، لوٹے اور ہلکا فیلڈ کا سامان غائب ہو گیا تھا۔ بعد میں یہ سامان ہوا کی سمت میں جا کر اکٹھا کیا جو کہ کم از کم ایک کلومیٹر دور تک پھیلا ہوا تھا۔

اسی کسمپرسی کی حالت میں طوفان کے تھمنے کے بعد کٹے پھٹے خیموں کو دوبارہ کھڑا کیا اور رات گزاری۔ صبح کا منظر اور بھی دل گرفتہ تھا کہ طوفانِ باد و باراں کی تباہی کھل کر سامنے آ رہی تھی۔

انھی ایام میں آرمی بڑا دربار دیکھنے کا موقع ملا، جنرل جاوید ناصر جو FWO کے انچارج تھے، ان سے ملاقات ہوئی۔ اکٹھے وضو کیا اور اسلامی فوج کے سالاروں میں سے ایک سالار کے بازو وضو کے دوران دیکھے تو اپنے اسلاف یاد آ گئے جن کی وجہ سے ہم باوجود بھٹکے ہونے کے بھی ایک شاندار ماضی کے مالک تھے۔

چُر کیمپ میں:

چُر کیمپ کے دو حصے تھے۔ نیچے والا سٹاف کے خیموں کے لیے اور اوپر والا افسران کے لیے۔ یہاں جنریٹر کی سہولت میسر تھی لیکن وقفے وقفے سے بجلی ملتی تھی۔ رات دس بجے کے بعد جنریٹر بند کیا جاتا اور پھر صبح نماز کے وقت چالو کیا جاتا۔ عجب اتفاق تھا کہ رات کو جب تک جنریٹر چلتا رہتا، تب تک ہوا بھی چلتی رہتی تھی۔ لیکن جیسے ہی جنریٹر بند ہوتا، ہوا بھی بند ہو جاتی اور مچھروں کے تابڑ توڑ حملے شروع ہو جاتے۔ اتنی شدید گرمی ہوتی کہ ہم ٹینٹ میں چلے جاتے اور مورٹین سلگا لیتے، جس

سے مچھر وقتی طور پر غائب ہو جاتا، لیکن جیسے ہی مورٹین کا اثر ختم ہوتا، مچھر نئے ساز و سامان کے ساتھ نئی فوج ہمراہ لیے پھر سے حملہ آور ہو جاتا۔ خٹک صاحب تو اپنے پاس پانی کا لوٹا رکھتے، جہاں کسی مچھر نے کاٹا، وہیں پانی ڈال کر اس جگہ کو دھوتے۔ اسی انسان و مچھر کی کشمکش میں رات گزر جاتی اور مچھر اپنے تمام اختیارات مکھی کے حوالے کر کے خود سو جاتا۔ پھر مکھی اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے سر انجام دیتی۔ اس زمانے میں کیمپ میں کسی قسم کا سپرے میسر نہیں تھا۔ سب کچھ قوم و ملّت کی خاطر سہنا پڑتا تھا۔ وہاں ملیریا، ٹائفائیڈ اور پیٹ کی بیماریاں عام تھیں اور ان سب کا ایک ہی علاج تھا جو سب کرتے تھے۔ وہ علاج تھا "جذبہ!" سب لوگ ایک دوسرے کی بیماریوں میں ان کا خیال رکھتے تھے۔ کچھ دوائیاں کیمپ میں موجود ہوتیں اور کچھ خرید لی جاتیں۔

مقامی لوگوں کے ساتھ چپقلش تو رہتی تھی، لیکن جہاں پانی کا مسئلہ آتا تھا، وہاں کچھ زیادہ ہی ہو جاتی۔ چُر کیمپ کے نزدیک ہی ایک بارشی پانی کا جوہڑ تھا جہاں مقامی لوگ اپنی اور اپنے جانوروں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ وہیں سے ہمیں بھی پانی لینا ہوتا تھا۔ کچھ ڈرلنگ کے لیے اور کچھ اپنے کیمپ کی ضروریات کے لیے۔ اس لیے یہ جوہڑ والا پانی ہمارے اور مقامی افراد کے درمیان جھگڑے کی بنیاد بنتا جا رہا تھا۔ ایک دن بخشو نامی ایک مقامی لیڈر نے اعلان کر دیا کہ آئندہ محکمے کے بندے اس جگہ سے پانی نہیں لے سکیں گے اور ساتھ نہایت خوفناک دھمکی بھی دے ڈالی۔ محمد اجمل صاحب ایک نڈر اور بے باک انسان تھے۔ قوم کے بھی جٹ تھے، وہ بھلا اس

طرح کی دھمکیاں کیسے برداشت کرتے، لہٰذا انھوں نے بھی اعلان کر دیا کہ 'آج شام کو میں آؤں گا واٹر ٹینکر کے ساتھ، دیکھوں گا کہ کون مجھے پانی بھرنے سے روکتا ہے!' چنانچہ اِدھر سے مقامی لوگوں کا جمگھٹا اور اُدھر سے اجمل صاحب کے ہمراہ چند ملازم۔ بحث مباحثہ بڑھتے بڑھتے لڑائی مارکٹائی تک معاملہ پہنچ گیا۔ (اس روز میں رخصت پر تھا اور یہ بات عملے کے ایک رُکن نے بعد میں مجھے بتائی تھی۔) بخشو نے کیا حرکت کی کہ اس نے اپنا جوتا اجمل صاحب کی طرف اچھال دیا اور یہ جوتا اجمل صاحب کو لگ بھی گیا۔ بہرحال کافی دیر جھگڑا اچلا اور پھر کیمپ والے بھی سب لوگ آ گئے اور بڑی مشکل سے 'ٹھنڈ ٹھنڈورا' ہوا۔ ادھر اجمل صاحب جوتا لگنے کے بعد بہت جذباتی ہو گئے اور شدید غصے میں آ گئے۔ کیمپ کے تمام افراد پریشان ہو گئے کہ اتنا بہادر انسان اور یوں بچوں کی طرح ضدی اور جذباتی ہو رہا ہے۔ بڑی مشکل سے نارمل ہوئے تو بولے، 'میں اس لیے نہیں پریشان کہ مجھے جوتا لگنے سے کوئی جسمانی تکلیف ہوئی ہے، بلکہ میں اس لیے جذباتی ہو رہا ہوں کہ میں جٹ آدمی ہوں اور بخشو ایک مراثی خاندان سے تعلق رکھنے والا، مجھے اس بے عزتی پر رونا آ رہا ہے۔' بڑی مشکل سے اجمل صاحب نارمل ہوئے اور یوں ایک اور صبر آزمارات ختم ہوئی۔

اسی کیمپ کا ایک اور ناخوشگوار واقعہ ہے کہ ہمارا ایک ڈرائیور جو بظاہر ایک شریف النفس اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا اس کے ہاں کچھ مہمان آئے اور اسکے ہی ٹینٹ میں رات کے قیام کی اجازت لی۔ اب واللہ علم رات کو کیا واقعہ پیش آیا کہ ڈرائیور کے ساتھ اس کے مہمانوں کا کوئی پہلے سے جھگڑا تھا کہ رات کو

سوتے وقت آپس میں جھگڑا ہوا اور ہمارے ڈرائیور کا قتل ہو گیا۔ جو لوگ مہمان بن کر آئے تھے انہوں نے ہی قتل کر دیا اور مارنے سے پہلے چائے میں کوئی بہوشی کی دوا شامل کر دی جس سے ڈرائیور ہوش سے بیگانہ ہو گیا اور ان کے لیے اس کا قتل آسان ہو گیا۔ صبح جب حالات و واقعات کا علم ہوا تو کیمپ میں انتہائی دہشت پھیل چکی تھی یہاں تک کہ کئی دنوں تک آفیسر لوگ اپنے خیموں کی بجائے نیچے سٹاف والے کیمپ میں ہی سوتے رہے۔ بڑی مشکل سے یہ دن بھی کٹے۔

اس سے بیشتر کہ میں ذرا آگے چلوں، تھوڑا سا اجمل صاحب کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اجمل صاحب ایک جری و بہادر اور کر گزرنے والے شخص تھے۔ انھوں نے کبھی بھی بعد والے نتائج پہ غور نہیں کیا، بس یکدم ایکشن لے لیا۔ بعد میں جو ہوتا ہے، ہوتا رہے۔ ایک واقعہ انھوں نے مجھے خود سنایا تھا کہ یونیورسٹی کے دور میں وہ ہاسٹل نمبر 1 میں رہتے تھے اور وہیں ایک اور صاحب تھے جن کو سب 'ہیرا' کہتے تھے۔ ہیرا صاحب ایک تنومند جوان قسم کے صاحب تھے اور باڈی بلڈنگ میں کافی نام رکھتے تھے۔ ہیرا کو اس زمانے میں سٹوڈنٹ یونین کی پشت پناہی بھی حاصل تھی اور بقول شخصے وہ اس یونین کے لیڈر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ایک دن کسی بات پر اجمل صاحب کا میس میں کوئی جھگڑا ہو گیا مگر اجمل صاحب کا امتحان بھی ہونے والا تھا، اس لیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیرا صاحب کی اجمل صاحب کے ساتھ ہاسٹل کی راہداری میں ملاقات ہو گئی۔ ہیرا نے اجمل صاحب کو گالی دے دی۔ بس گالی کا سننا تھا کہ اجمل صاحب کا دماغ گھوم گیا۔

ایک زناٹے دار تھپڑ ہیرا کے بائیں گال پر پڑا۔ پوری راہداری تھپڑ کی آواز سے گونج اٹھی۔ آناً فاناً خاموشی طاری ہو گئی۔ بعد میں اجمل صاحب کو ہیرا اور اس کے حواریوں نے بہت پھینٹا لگایا اور اجمل صاحب 'نیلو نیل' ہو گئے اور اسی حالت میں پرچہ بھی دیا۔

اسی طرح اجمل صاحب کا ایک اور جھگڑا ایک بس کنڈیکٹر کے ساتھ ریگل چوک لاہور میں ہوا۔ وہاں بھی اجمل صاحب نے زناٹے دار تھپڑ اس کنڈیکٹر کے منہ پر دھرا اور بعد میں وہاں موجود لوگوں سے پھینٹی بھی کھائی۔

اسی طرح میرا چشمِ دید واقعہ سروے کیمپ میں زیدی صاحب کے ساتھ پیش آیا۔ یہاں بھی اجمل صاحب کا تھپڑ چلا اور زیدی صاحب کے ناک سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ غرضیکہ اجمل صاحب اپنی طبیعت کی وجہ سے مسئلے مسائل پیدا کر لیتے تھے اور بعد میں کسی حد تک حل بھی کر لیتے تھے۔

اسی چُر کا ایک واقعہ ہے کہ مقامی لوگوں نے ایک غیر مقامی عورت خریدی جس سے وہ سارا دن پانی ڈھونے اور جلانے والی لکڑیاں اکٹھا کرنے کا کام لیتے تھے۔ وہ عورت تنگ آ کر ایک دن ہمارے کیمپ میں آگئی اور رو دھو کر اجمل صاحب کو قائل کر لیا کہ مجھے ان ظالموں سے رہائی دلائیں۔ بس پھر کیا تھا، اجمل صاحب راتوں رات اس عورت کو ڈی جی خان چھوڑ کر آئے اور مقامی لوگوں کے ساتھ ایک نیا پھڈّا شروع ہو گیا جو بڑی مشکل سے ختم ہوا۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں ڈیلی ویجر کے طور پر کام کرتا تھا۔ بھائی جان

کی فیملی لاہور گئی ہوئی تھی اور اجمل صاحب کو شدید ملیریا ہوا تھا۔ بھائی جان بے چارے اپنی فیاضانہ طبیعت کی وجہ سے اور کچھ حقِ دوستی ادا کرتے ہوئے اجمل صاحب کو اپنے گھر لے آئے اور رضائی اوڑھا دی۔ اجمل صاحب بیماری کی حالت میں بالکل بچوں کی طرح ہو جاتے تھے۔ کبھی بچوں کی طرح ضد کرتے اور مچلتے، کبھی غصے میں آ جاتے، یہاں تک کہ گھریلو قسم کی گالیاں بھی دینا شروع ہو جاتے۔ 'او بھائی جان کے بچے میں مر رہا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ۔' اس طرح کے ڈائیلاگ وقفے وقفے سے کمرے میں گونج رہے تھے۔ بھائی جان کا اپنا ایک سٹائل ہے اور وہ اپنی طبیعت کے ساتھ مگن ہوتے ہیں۔ کوئی جلد بازی نہیں اور ہر کام ٹھنڈے طریقے سے کرنے کے عادی۔ اجمل صاحب گالیاں دیتے دیتے یکدم جذباتی ہو گئے اور کہنے لگے کہ 'میں مر جاؤں گا۔ میری بیٹی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ ہائے میں کیا کروں۔' یہ ڈائیلاگ کئی دفعہ دہرانے کے بعد میری طرف دیکھا اور کہا، 'عباس میں مر رہا ہوں۔' میں نے کہا، 'اچھا کوئی بات نہیں، تم مر جاؤ گے اچھا ہے۔ میں ڈیلی ویجر سے ریگولر ہو جاؤں گا اور تمھاری سیٹ مجھے مل جائے گی۔' یہ سن کر اجمل صاحب تڑپے اور بالکل نارمل ہو گئے اور اپنا مشہور ڈائیلاگ 'کیا بکواس کرتے ہو' بہترین پرفارمنس کے ساتھ ادا کیا۔ اُدھر کافی گالیاں کھانے کے بعد جناب بھائی جان ہاتھ میں چائے کا کپ لیے چسکیاں لگاتے ہوئے آئے۔ وہاں پہنچ کر ایک اور چسکی بڑے سٹائل سے لی اور کپ احتیاط سے میز پر رکھا۔ بالکل اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ بھائی جان کا اگلا قدم کیا ہو گا۔ دفعتاً اجمل صاحب کی اوڑھی ہوئی رضائی زور سے کھینچی اور سخت

غصے میں گویا ہوئے، 'دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ایک تو تمھاری تیمارداری کروں، دوسرا تمھاری باتیں سنوں۔ جاؤ اپنے ہاسٹل کے کمرے میں چلے جاؤ۔' اجمل صاحب نے بھائی جان کا جب یہ روپ دیکھا تو 'لوئر پروفائل' میں چلے گئے اور ساتھ ہی معصومانہ چہرہ بنالیا۔ پھر مچلنے لگے: 'مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو، پھر میں ٹھیک ہو جاؤں گا اور ایسی حرکتیں نہیں کروں گا۔' ڈی جی خان میں ویسے تو کافی ڈاکٹر تھے لیکن ڈاکٹر اشفاق جسکانی بہت مشہور تھے۔ ان کے پاس انھیں لے جایا گیا۔ وہاں جس طریقے سے اجمل صاحب نے ڈاکٹر کو اپنی حالت سے آگاہ کیا، وہ بھی ایک کمال تھا۔ بہر حال ڈاکٹر جسکانی نے حسبِ معمول کچھ انجکشن لگائے اور کھانے کو کچھ دوائیاں دیں۔ اب پتا نہیں ان ٹیکوں کا کوئی کمال تھا جن میں شاید سٹیرائڈ تھا، کہ اجمل صاحب وہیں شہر میں ہی خود کو ٹھیک ٹھاک محسوس کرنے لگ پڑے۔ بڑے خوش ہوئے کہ جسکانی تو کوئی بہت پہنچا ہوا ڈاکٹر ہے۔ جھٹ سے ایک مٹھائی کا ڈبہ لیا اور جسکانی صاحب کو ان کے کلینک دینے پہنچ گئے۔ ساتھ شکریہ بھی ادا کیا اور حیران کن حد تک چنگے بھلے دکھائی دینے لگے۔ ڈاکٹر جسکانی نے شکریہ کے ساتھ مٹھائی کا ڈبہ وصول کیا اور ہم لوگ رات کے تقریباً گیارہ بجے واپس کالونی پہنچے۔ وہاں پہنچ کر اجمل صاحب نے اعلان کر دیا کہ 'میں بھائی جان کے گھر میں نہیں رہوں گا بلکہ مجھے ہاسٹل میں میرے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔' چنانچہ اجمل صاحب کے حکم کی تعمیل کی گئی اور ان کو ہاسٹل والے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

صبح صبح نماز کے بعد میں اجمل صاحب کی خیریت دریافت کرنے ان کے

کمرے میں گیا تو وہی غصّہ والی کچھ قابلِ برداشت اور کافی زیادہ ناقابلِ برداشت گالیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اور ساتھ ساتھ شاید ہی کوئی سینئر آفیسر ہو جس کا باقاعدہ نام لے کر گالی نہ دی ہو۔ پتا چلا کہ جب تک سڑیرائیڈ کا اثر رہا، اجمل صاحب ٹھیک رہے اور جیسے ہی اثر ختم ہوا، ملیریا اور اس کے اثرات دوبارہ نمودار ہوئے اور وہ مٹھائی 'حرام' گئی۔ بہر حال باقاعدہ علاج ہوا اور دو ہفتے کے بعد اجمل صاحب رو بہ صحت ہوئے۔ اس طرح کے کئی کمالات اجمل صاحب کے نام منسوب ہیں، ان شاء اللہ جہاں جہاں پیش آتے ہیں وہاں ان کا تذکرہ ضرور ہو گا۔ چنانچہ بخشو مراثی والے واقعے کے بعد میں اور اجمل صاحب کچھ دنوں کے لیے مین آفس میں رپورٹ کرنے کے لیے آ گئے۔

ڈی جی خان آفس میں:

یہاں پر ایک آفس آرڈر کے بموجب میں سپورٹس کم جوائنٹ سیکریٹری آفیسرز ریکریشن روم بنادیا گیا جس میں شام کے اوقات میں آفیسرز ٹی وی دیکھتے اور کچھ اِن ڈور گیمز بھی کھیلی جاتیں۔ تقریباً تمام ہی لیجنڈ افسران یہاں آتے جس میں خاص خاص جناب ریاض (مرحوم)، راناصاحب، جناب شیخ صاحب (مرحوم)، قمر صاحب، ڈار صاحب، عبدالمجید صاحب، چودھری صاحب، صغیر صاحب، منیر صاحب اور بھائی جان وغیرہ ہوتے۔

ایک دن غالباً چھٹی والا دن تھا، جب دوپہر کے وقت ہم لوگ ریکریشن روم

میں تھے اور ٹی وی آن تھا۔ یکایک ٹی وی کی باقاعدہ نشریات تھم گئیں اور ساتھ ہی تلاوتِ قرآن پاک نشر ہونا شروع ہو گئی۔ یہ 18 اگست 1988 کا دن تھا۔ ہم سب حیران و پریشان ہوئے اور ٹی وی سکرین پر ایک نیوز کاسٹر کا چہرہ نمودار ہوا جس نے اعلان کیا کہ بہاولپور کے نزدیک جنرل ضیاء الحق کا طیارہ کریش ہو گیا ہے اور اس میں جنرل صاحب سمیت دیگر کئی اعلیٰ افسران بھی شہید ہو گئے ہیں۔ اتنا اندوہناک حادثہ تھا کہ کسی بھی شہید کی میت سالم نہ ملی بلکہ سب کے سب جل کر راکھ ہو گئے (انا اللہ وانا الیہ راجعون)۔ ہم سب سکتے میں آ گئے۔ حیرت زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اتنی ناقابلِ یقین خبر اعصاب کو شل کر گئی۔ بہر حال بات سچ تھی، جنرل ضیاء الحق اور ان کے رفقا کا جتنا کام تھا، وہ کر گئے اور وقت کا بے رحم پہیہ اپنے نئے دور میں داخل ہو گیا۔

دسمبر 1990 میں میری پروموشن اسسٹنٹ جیالوجسٹ سے جیالوجسٹ کے رتبے میں ہو گئی تھی اور پھر وقت گزرتا رہا۔ کبھی ایک فیلڈ کبھی دوسرا فیلڈ، ڈی جی خان کا مغربی اور شمالی علاقہ، راجن پور، شیخ صاحب اپنی ان تھک کاوشوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نئے نئے قیمتی علاقہ جات ڈھونڈنے کی کوششوں میں مصروف رہے اور وقت گزرتا رہا۔

ستمبر 1992 میں اللہ تعالیٰ نے مجھے محمد بلال قریشی عطا کیا اور میں نے کچھ ہی ماہ بعد اپنی فیملی لاہور سے ڈی جی خان میں شفٹ کر لی۔

یہ شیخ صاحب مرحوم کے مینیجر بننے کے ابتدائی دور کی بات ہے جب اجمل

صاحب ہمیں چھوڑ کر انگلینڈ اپنی فیملی کے ہمراہ چلے گئے اور ہم ایک باصلاحیت اور رونقی افسر سے محروم ہو گئے۔

ڈی جی خان کے شمالی پہاڑی علاقے میں دوبارہ آمد:

یہ غالباً 1993 کے آخر کی بات ہے جب خان صاحب کی قیادت میں ہم ایک بار پھر کھدائی والی مشینوں اور ایک مکمل سروے کیمپ کے ہمراہ اس علاقے میں کیمپ پذیر ہوئے۔ اس دفعہ ایک بڑا سیٹ اَپ تھا جس میں وائرلیس آپریٹر، سرویئرز، ڈرلرز اور تمام ضروری حصہ دار کیمپ کا حصہ تھے۔ اس لیے ہم نے بارتھی ہیلتھ سنٹر جو کہ بغیر کسی عملہ کے تھا، وہاں پڑاؤ کر لیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد سروے آف پاکستان کا ایک کیمپ جو سات آٹھ افراد پر مشتمل تھا، وہ بھی اسی ہیلتھ یونٹ میں آ گیا اور یوں اچھی خاصی رونق بن گئی۔

یہ واقعہ ایک ساتھی نے سنایا تھا۔ میں ان دنوں لاہور میں تھا کیونکہ جناب محمد مطاہر جمال صاحب میرے دوسرے صاحب زادے جو 27 اکتوبر 1994 میں دنیا میں تشریف لائے تھے نمونیہ کا شکار ہو کر ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ سروے آف پاکستان کے کیمپ کا باورچی بڑے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کا درمیانے قد کا تھا، بلکہ یوں سمجھ لیں کہ 'سینڈو خان' تھا۔ دسمبر کی سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور راتیں بھی اندھیری تھیں۔ کافی بھاری رضائیوں کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ انھیں راتوں کا ذکر ہے کہ سب لوگ جب تھک ہار کر سو گئے اور تقریباً رات 12 بجے کا وقت تھا،

دفعتاً کیمپ میں ایک شور شرابا شروع ہو گیا۔ کوئی شخص بہت بھاری اور اونچی آواز میں ڈائیلاگ بول رہا تھا، "اوئے میں چھوڑوں گا نہیں۔ میں جان سے مار دوں گا۔ مجھے چھوڑو، کون ہو تم؟" وغیرہ وغیرہ۔ اب اتنی ٹھنڈی اور اندھیری رات جہاں پہ ہم گنتی کے نفوس تھے اور قریب ترین بستی بھی سات آٹھ کلومیٹر کی دوری پر تھی، وہاں پر مکمل سناٹے میں ایسی آوازوں کا گونجنا اور ساتھ ہی 'اوئے پکڑو اس کو، جانے نہ پائے۔ تم ادھر سے، اوئے تم ادھر سے' وغیرہ وغیرہ۔ پہلے پہل تو ہم سب لوگ رضائیوں میں دبکے رہے لیکن جب شور بڑھ گیا، آوازیں تیز ہو گئیں تو رضائیوں کو چھوڑا اور جہاں سے آوازیں آرہی تھیں، اُس طرف بھاگے۔ وہاں ایک عجیب منظر تھا۔ وہی سروے آف پاکستان والوں کا باورچی آپے سے باہر نظر آیا۔ بہت مضبوط جسم کا سینڈو خان، اس کو دو دو ڈرلرز نے دونوں اطراف سے پکڑا ہوا تھا۔ خان صاحب، امان اللہ وائرلیس آپریٹر، رشید، عارف، ملک صاحب اور دوسرے ڈرلرز وہاں موجود تھے۔ کوارٹر میں مکمل افراتفری مچی ہوئی تھی اور وہ سینڈو خان بپھرا ہوا شیر نظر آرہا تھا۔ یکایک اس نے اپنی داہنی طرف والوں کو دیکھا جنھوں نے اس کا بازو پکڑا ہوا تھا، ایک جھٹکا دیا اور وہ دونوں ڈرلرز دیوار پر پٹخ دیے۔ اسی طرح بائیں بازو والوں کو بھی دوسری دیوار پر پٹخ دیا۔ وہ تمام افراد دوبارہ اٹھے اور اس کو قابو کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اسی دوران امان اللہ نے، جو کہ ایک باریش اور ذکر اذکار کرنے والے شخص تھے، اس کی ایک چھوٹی انگلی کو کسی طرح قابو کر لیا اور بولا، 'خان صاحب، سورۃ جن پڑھیں۔' خان صاحب حافظِ قرآن ہیں، انھوں نے

سورۃ جن پڑھنا شروع کی، ساتھ ہی امان اللہ نے اپنا زور بڑھایا اور باورچی کا جوش آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑنا شروع ہو گیا۔ کرتے کرتے وہ بالکل نارمل ہو گیا اور ڈرلرز کی گرفت بھی ڈھیلی ہونی شروع ہو گئی۔ جیسے ہی سورۃ جن کی تلاوت ختم ہوئی اور ہم لوگ مطمئن ہو گئے کہ اس میں داخل غیر مرئی طاقت یا جن بھوت جو بھی تھا، وہ بھاگ گیا ہے تو ایک دم سے اس نے اپنے آپ کو چھڑایا اور پھر سے وہی نعرے اور ڈائیلاگ کہنے شروع کر دیے، 'اوئے میں چھڈاں گا نہیں، میں مار دیاں گا،' وغیرہ وغیرہ۔

کہانی پھر پلٹ گئی۔ سارے ڈرلرز دوبارہ سے متحد ہوئے اور اس کو قابو کیا۔ ساتھ ساتھ سردی، ڈر اور دھینگا مشتی بڑی عجیب کیفیت میں تھے کہ امان اللہ نے پھر ہمت کی اور اس کے پیچھے جا کر اس کے سر کے پیچھے والے بال مضبوطی سے جکڑ لیے۔ پھر بولا، 'خان صاحب اب آپ سورۃ یٰسین پڑھیں۔' انھوں نے سورۃ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی۔ جب دو رکوع ہو گئے تو سینڈو خان کی مزاحمت بھی تقریباً ختم ہو گئی۔ اب اس نے رونا اور گڑگڑانا شروع کر دیا۔ 'مجھے چھوڑ دو، اب میں واپس چلا جاؤں گا۔ خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔' امان اللہ نے اس کے بال مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے اور اپنی گرفت مزید سخت کر دی تھی۔ اس لیے اس کا رونا اور گڑگڑانا مزید بڑھ گیا۔ خان صاحب بولے، 'تم نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے، اب ہم تمھیں نہیں چھوڑیں گے۔ بلکہ تمھیں آگ لگائیں گے۔' اس پر وہ اور چیخا اور بولا، 'میں کافر جن نہیں ہوں۔ میں مسلمان جن ہوں اور اس کو سزا دینے آیا تھا۔ اس نے

سیدے شاہ کے مزار پر کوئی منت مانی تھی اور کام مکمل ہونے کے بعد منت نہیں اتاری۔ اس لیے میں اس کو سزا دینے آیا تھا۔ اب میں نے اس کو سزا دے دی ہے لیکن مجھے چھوڑ دیں۔ میں اب دوبارہ ادھر نہیں آؤں گا۔' خان صاحب نے مزید ایک دو سخت باتیں کیں اور اس سے دوبارہ نہ آنے کے وعدے پر امان اللہ کو اشارہ کیا۔ امان اللہ نے اس کے بال چھوڑے اور وہ متاثرہ شخص دھڑام سے چارپائی پر گر گیا۔ ہم نے فٹافٹ اس کی رضائی اس پر ڈالی، کمرہ بند کیا اور جلدی جلدی وہاں سے نکل آئے۔ صبح کے تقریباً 4 بج رہے تھے جب ہم اپنے بستروں میں پہنچے۔

اگلے روز دن گیارہ بجے کے آس پاس اس باورچی کے پاس گئے۔ اسی دوران وہ جاگ گیا تھا اور بے حد کمزوری کا اظہار کر رہا تھا۔ اس سے رات والے واقعے کی بابت پوچھا تو اس کو کوئی بات بھی یاد نہ تھی۔ شاہ کے مزار کی بابت پوچھا تو بولا، 'ہاں ہاں، ہمارے گاؤں کے ساتھ سیدے شاہ کا مزار ہے لیکن میں وہاں کبھی نہیں گیا اور نہ ہی کوئی منت وغیرہ مانی ہے۔' قصہ مختصر کہ اس کی حالت کو نارمل دیکھ کر ہم لوگ بھی اپنے اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس واقعے کی دہشت و ہیبت اتنے سالوں تک رہی کہ جب بھی یہ واقعہ یاد آیا، رونگٹھے کھڑے ہو گئے۔

بعد میں جب کسی سینئر افسر کے ساتھ یہ واقعہ ذکر ہوا، اس نے بمشکل ہی یقین کیا۔ میں چونکہ خان صاحب کے ساتھ شروع سے ہی تھا اور کئی ایسے واقعات کا چشمِ دید گواہ تھا، اس لیے مجھے پورا یقین تھا کہ خان صاحب نے اسی بہادری سے مقابلہ کیا

ہو گا جس بہادری سے یہ واقعہ بیان ہوا ہے۔ اسی طرح کے بے شمار واقعات آگے بھی آئیں گے جن کو بیان کرنے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ ادارہ کے ملازمین چاہے افسران ہوں یا سٹاف، ہر قسم کے مقابلے کے لیے تیار رہتے تھے اور گھبراتے بالکل نہ تھے۔

ہمارے ایک اور افسر تھے جناب بنارس خاں مرحوم، یہ بھی جیالوجسٹ تھے۔ ان کی بیگم کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہو گیا تھا اور ان کا علاج کرنے والوں میں خان صاحب بھی شامل تھے۔

تکنیکی تربیت:

1994-1993 کے دوران ہم نے بارتھی، تھل سر، ترنگ وغیرہ کے علاقوں میں کھدائی کی اور کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا جس کو آزمایا نہ ہو، لیکن کچھ معاملات ایسے تھے کہ ہم گوہر مقصود کے شکار میں ناکام رہے۔ یہاں سے اٹھے اور واپس ڈی جی خان چلے گئے۔ وہاں پہ ایک ایکسپرٹ کی زیرِ قیادت چند غیر ملکی جیالوجسٹ آئے ہوئے تھے اور اپنے اس وزٹ کا آغاز لاہور سے کرنے کے بعد گارج کیمپ میں براجمان تھے۔ مسٹر وانگ سے پہلے بھی مختلف وفود آتے رہے جن میں ڈرلنگ، مائننگ اور جیالوجی کے ماہرین شامل رہے۔ 1988 میں جو وفد آیا تھا وہ مائننگ سے منسلک تھا اور اس گروپ نے ہمیں مائننگ کی ایک نئی تکنیک سے متعارف کروایا۔ یہ تکنیک آسان اور کفایتی تھی اور اس وقت تک امریکہ اور روس کے بعد چین والے

بھی اسی تکنیک سے مائننگ کر رہے تھے۔

مجھے یاد ہے شروع شروع میں ڈار صاحب، بوٹا صاحب، اعوان صاحب، جناب الیاس صاحب، خان صاحب، اعجاز صاحب اور میں اس گروپ میں شامل تھے جس نے اس تکنیک کی ابتدائی تربیت حاصل کی۔

ابتدائی تربیت کے بعد جب اس طریقہ کو اپنی سائیٹ میں آزمانا چاہا تو کچھ تکنیکی اعداد و شمار (ڈیٹا) مطابقت میں نہ آسکا۔ پھر دوسرے پراجیکٹ کے نزدیک سائیٹ کا ڈیٹا منگوایا گیا جو مطابقت میں آیا اور اس طرح پہلے پہل اس دوسری سائیٹ پر نئ تکنیک کی بنیاد پر مائننگ شروع کی گئی۔ بعد میں ادارہ کے سائنس دانوں اور انجینئرز کی خداداد صلاحیتیں چمکیں اور اب ہر جگہ اسی تکنیک کی بدولت مائننگ ہو رہی ہے۔

غیر ملکی ایکسپرٹ اور انکی ٹیم ہمیں گوہر مقصود سے منسلک جیالوجی کے بارے میں ابتدائی اہم پیش رفت کے سلسلے میں تربیت دینے کے لیے آئے تھے۔ اور انھوں نے گوہر مقصود کی فلاسفی جس میں اس خاص دھات کا پیدا ہونا، پھر جائے پیدائش سے سفر کر کے موجودہ جگہ میں آنا اور پھر موجودہ جگہ میں براجمان ہونا شامل تھا، پانچ چھے ماہ میں اس بہترین طریقے سے بتایا کہ ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ وہی نشانیاں جو ہم روز دیکھتے تھے، لیکن درگزر ہو جاتی تھیں، غیر ملکی ماہرین کے بتائے ہوئے علم کی روشنی میں چمکنے لگیں اور ہمیں صحیح معنوں میں موقع ملا کہ اب ہم پاکستان کے دوسرے علاقوں میں شکار کو کیسے تلاش کر سکتے ہیں۔ اس سیکھنے والی ٹیم کے انچارج بھی جناب خان صاحب تھے جو نہ صرف خود معاملات کو سمجھتے تھے بلکہ

ہمارے استفسار کرنے کے بعد ہمیں سمجھاتے بھی تھے۔ یقیناً ہمارے علم میں ایک روشن دار اضافہ ہو گیا۔ اسی سلسلہ میں ایک دفعہ میں اور خان صاحب کچھ پانی کے نمونے لینے کے لیے گارج کیمپ کے نزدیک کوہِ سلیمان کے دامن میں واقع تازہ پانی کے چشموں کے پاس گئے۔ پہلے پہل تو اس علاقے کی خوبصورتی، قدرتی ماحول، جھرنوں اور ان کی آواز، پرندے اور ان کی چہچہاہٹ، یہ سب فطرتی حسن دیکھ کر بالکل یقین نہ آتا تھا کہ ہم ڈی جی خان جیسے علاقے میں ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جنت کی کوئی وادی ہے اور اس میں ہم گھوم رہے ہیں۔ ایسا نظارہ تھا کہ میں بالکل مبہوت ہو گیا۔ گاڑی کھڑی کی اور تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر تک پیدل چلے۔ نمونے اکٹھے کرنے کا سارا سامان میں نے اور خان صاحب نے اٹھایا اور لمبے لمبے قدموں کا استعمال کرتے ہوئے پہلے چشمے کی طرف گئے۔ وہاں سے تین یا چار نمونے اکٹھے کیے اور بعد میں اس سے ذرا اوپر تھوڑے فاصلے پر ایک اور چشمہ ملا۔ پانی ایسا صاف ستھرا کہ اس میں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے کنکر تک نظر آ رہے تھے۔ ٹھنڈا ایسا کہ دل کرے اس کو پیتے ہی رہیں۔ مغرب کا وقت نزدیک تھا، میں وضو کرنے کی نیت سے نمونے اکٹھے کرنے کے بعد آستین چڑھانے لگا۔ اس بار خان صاحب میرے آس پاس نظر نہ آئے بلکہ کچھ غیر مطمئن سے کبھی آتے اور پھر پلٹ جاتے۔ میں نے قطعاً محسوس نہیں کیا کہ کوئی غیر معمولی کیفیت ہے۔ ابھی میں وضو سے فارغ ہوا ہی تھا کہ یکدم آئے اور نمونے والی بوتلیں تھامیں اور مجھے غصے سے کہنے لگے، 'اٹھو، جلدی کرو۔ اور چلو تم کیا یہاں ڈیرہ ڈال کے بیٹھے ہوئے ہو؟' میں ان کی کیفیت کو بھانپ گیا کہ

کچھ گڑبڑ ضرور ہے اور کسی تابع فرمان کی طرح جلدی جلدی بوٹ پہنے، سامان اٹھایا اور چل پڑا۔ چلنا کیا تھا، دوڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک خان صاحب کی رفتار ویسے بھی زیادہ ہے اور دوسرا ہنگامی صورتِ حال بھی تھی۔ تو جناب ہم تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر تک مع سامان کے دوڑتے رہے۔ یہاں تک کہ گاڑی کے نزدیک پہنچے۔ فٹافٹ سارا سامان گاڑی میں رکھا اور اندر سیٹوں میں گر گئے۔ میں نیم غصہ کی حالت میں گویا ہوا، 'کیا بات ہے خان صاحب؟ اب کیا ہوا، کیوں اتنا بھگا دیا۔ اتنا لطف اندوز ہو رہا تھا۔' میری بات سن کر بولے، 'تم جہاں چھاؤنی ڈال کر بیٹھ گئے تھے، یہ ان کا مسکن تھا اور وہ وہاں پر آ رہے تھے۔ مجھے لگا جیسے کہ تمھیں نقصان پہنچا دیں اس لیے میں نے اس افراتفری کا مظاہرہ کیا ہے۔' چونکہ خان صاحب کے پرانے تجربے کچھ ایسے تھے، اس لیے ان کی بات پر فوراً یقین کر لیا اور خاموشی سے باقی ماندہ سفر طے کیا۔

اسی غیر ملکی ٹیم کے ساتھ بار تھی، راجن پور وغیرہ بھی دیکھا اور آہستہ آہستہ فیلڈ جیالوجی کا فلسفہ سمجھ میں آنا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ جو اس سے پہلے علمی تشنگی یا کمزوری تھی کہ اس علم کو کیسے سیکھا جائے اور دوسرے علاقوں میں کیسے اس کا استعمال کیا جائے، وہ جاتا رہا۔

یہاں پر ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ دل آج بھی اس کو یاد کر کے خوش ہو جاتا ہے۔ اور ایک طمانیت جیسی کیفیت ہوتی ہے۔ ہوا یوں کہ شیخ مرحوم شروع ہی سے میرے استاد تھے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کا فیلڈ جیالوجی کے فلسفہ پر کافی عبور تھا اور اکثر اوقات وہ لمبے لمبے لیکچر بھی دیا کرتے تھے۔ ان کی

انگریزی بھی خوب تھی، محنتی بھی تھے اور سب سے بڑھ کر سیکھنے کا بہت شوق رکھتے تھے۔ وہ ہمارے مینیجر تھے اس لیے فیلڈ گروپ کے ساتھ نہیں تھے۔ لیکن ہماری مصروفیات اور سیکھنے کے درجات سے خوب واقف تھے۔ جب ابتدائی مشاہدات برائے فیلڈ جیالوجی کی بات کی جاتی اور ہم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو ٹپ دیتے تو شیخ صاحب مرحوم بظاہر خاموش نظر آتے لیکن ساری توجہ ہماری گفتگو کی طرف ہوتی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہم میں سے کس کو کہتے کہ مجھے بھی یہ پراسیس سمجھاؤ۔ شاید سُبکی محسوس کرتے ہوں کیونکہ اس وقت تک فلسفہِ فیلڈ جیالوجی کے سب سے بڑے جانکاری رکھنے والی شخصیت وہ خود ہی تھے۔ اسی اثناء میں وہ جو 450 میٹر والی لائن تھی، جو سائیٹ میں بنائی گئی تھی، اور جس کے ہر 20 میٹر پر ہم نوٹس لے رہے تھے، وہ مکمل ہو گئی اور اس مشاہداتی سروے کے نتائج نے ہمیں اتنی خوشی دی کہ ہم سب لوگ اپنے آپ کو ایک تجربہ کار سائنس دان سمجھنے لگے۔

شیخ صاحب مرحوم نے مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ 'کل ہم لوگ مشاہداتی سائیٹ میں جائیں گے۔ میں اور تم، ساتھ صرف ڈرائیور ہو گا اور تم مجھے ابتدائی مشاہداتی سروے سمجھاؤ گے اور پورے دن کی بجائے آدھے دن کا DA چلے گا، سمجھے!'

میں چونکہ اس وقت تک بلوغت کی سٹیج سے گزر کر تھوڑا اور اوپر جا چکا تھا، مجھے ایک شرارت سوجھی، میں نے کہا، 'ٹھیک ہے سر۔ صبح چھے بجے چلا جائے گا اور شام تک واپس آجائیں گے۔'

میرے لیے یہ ایک نادر اور سنہری موقع تھا کہ میرے استادِ محترم مجھ سے کچھ

سیکھنا چاہ رہے تھے۔ لہٰذا اگلے دن تقریباً 9 بجے صبح ہم لوگ اس 450 میٹر لمبی لائن کے مغرب والی آخری بُرجی پر پہنچ گئے۔ لکھنے پڑھنے کا سامان اپنے اپنے ہاتھوں میں لیا اور سب سے پہلے میں نے شرارتی انداز میں کہا، 'سر جی آپ میرے مینیجر ہیں اور استاد بھی لیکن آج چونکہ میں آپ کو ایک نئی تکنیک سے آگاہ کر رہا ہوں، اس لیے سب سے پہلے تو آپ اپنے آپ کو مینیجر نہیں سمجھیں گے اور مجھے استاد سمجھیں گے۔ دوسرا آپ نے پورے وقت کے دوران بولنا نہیں، نہ ہی مجھے ڈانٹنا ہے۔ جب 450 میٹر لمبی لائن مکمل ہو جائے گی تو پھر سوالات کرنے ہیں۔'

آئے ہائے، یہ بات سن کر شیخ صاحب نے جس خندہ پیشانی سے برداشت کا مظاہرہ کیا، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ مجھ جیسا کھوٹا سکّہ، نالائق پانڈا، اس وقت جس طرح ہر بُرجی پر لیکچر دے رہا تھا، اور کمال کا علم نچھاور کر رہا تھا، مجھے خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنے مشکل مشکل تکنیکی الفاظ تسبیح میں پروئے ہوئے دانوں کی طرح نکل رہے تھے کہ واہ کرتے کرتے آخری بُرجی جب مکمل ہوئی تو کیا منظر تھا کہ شیخ صاحب نے میرے دائیں کندھے پر پُرجوش تھپکی دی اور ساتھ میں کہا، 'ویلڈن قریشی!' یہ لمحہ یہ گھڑی مجھے ساری زندگی نہیں بھولے گی۔ یہ سب سے پہلا ایوارڈ تھا جو مجھے شیخ صاحب مرحوم کے ہاتھوں ملا اور جو بعد میں بے شمار انعامات اور اعزازات کی پہلی کڑی ثابت ہوا۔

شیخ صاحب مرحوم خداداصلاحیتوں کے مالک تھے۔ بیک وقت بہترین ارضیاتی

سائنس دان، زبردست منتظم، دین دار، پکے نمازی اور قرآن پاک کے قاری، یعنی ہر فن مولا آدمی۔ بظاہر سخت گیر اور غصیلے۔ مسلمان عام طور پر اور مولوی حضرات خاص طور پر آپ کے غضب کا نشانہ بنتے۔ وہ تو بعد میں علم ہوا کہ شیخ صاحب مسلمانوں خاص کر داڑھی والے مسلمانوں کے کیوں مخالف تھے۔ ان کے خیال میں مسلمان اپنے مقرر کردہ راستوں کو چھوڑ چکے تھے جس کی وجہ سے دنیا میں غیر مسلم اقوام راج کر رہی ہیں۔ اور ہر وہ کام جس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے، وہ وہی کرتے ہیں۔ مثلاً نماز تو پڑھتے ہیں لیکن ساتھ ہیرا پھیری، بے ایمانی، ملاوٹ، دروغ گوئی، جان بوجھ کر حرام کام کرتے ہیں۔ بالعموم منافقت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں اور انتہائی ہڈ حرام ہیں، جس کی وجہ سے دنیا بھر میں ہر محاذ پر ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ شیخ صاحب مرحوم نبی کریم ﷺ سے شدید محبت کرتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے، 'دیکھو عباس! میرا نام ہے شیخ اکرم اور نبی کے نامِ مبارک کے ساتھ بھی اکرم لگتا ہے۔ اس لیے مجھے ان سے خاص نسبت ہے۔'

جناب شیخ صاحب مرحوم جیالوجسٹ تو نمبر ون تھے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اکاؤنٹس، پروکیورمنٹ، آڈٹ اور ورکشاپ میں مکینیکل کے معاملات کو بھی سمجھتے تھے۔ اکاؤنٹس والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ شیخ صاحب صاحب ہمارا آدھا کام آسان بنا دیتے ہیں۔ اور تو اور عارف صاحب بھی اکثر کہتے تھے کہ 'دیکھو یار، مکینیکل انجینئر ہم ہیں لیکن شیخ صاحب اکثر ہمیں راہنمائی عطا کرتے ہیں۔'

شیخ صاحب صاحب ہر معاملے میں تو ہوشیار تھے ہی لیکن مالی معاملات میں کچھ

زیادہ ہی ٹچی تھے۔ ڈی.جی خان میں قیام کے دوران مجھے فیلڈ کو آرڈینیٹر سیکنڈ ان کمانڈ ورکشاپ، پروکیورمنٹ آفیسر اور ٹرانسپورٹ آفیسر بنایا ہوا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے اور مختلف نوعیت کے کاموں کی وجہ سے میں اکثر جھنجھلا جاتا تو کہتے، "قریشی ایک وقت آئے گا، تُو یاد کرے گا!" اور واقعی جب میں کے۔پی۔ کے ایک بڑے کیمپ کا کوارڈینیٹر بنا اور ڈرلنگ، ورکشاپ، جیالوجی، ٹرانسپورٹ اور مائننگ کے معاملات سر پر پڑے اور پرانے تجربے کے فوائد سامنے آئے، تو جناب شیخ صاحب مرحوم کی بات اور خود شیخ صاحب بہت یاد آئے۔ (اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین!)

وقت گزرتا گیا، شیخ صاحب مرحوم کی مینیجری میں ہم نے راجن پور ڈویژن میں بھی کافی زور آزمائی کی۔ کام کی رفتار ایک خاص جوش و جذبے سے جاری و ساری تھی کہ 1998 میں شیخ صاحب مرحوم کو کوئی طبعی پیچیدگی ہو گئی۔ میں خود شیخ صاحب کو مختلف ڈاکٹروں کے پاس لے جاتا۔ کچھ دوائیوں کا اثر تھا کہ شیخ مرحوم پر عضلاتی حملہ ہوا جس کی وجہ سے بات کرنا مشکل ہو گیا، لیکن غضب کے بندے تھے کہ دفتر آنا بند نہ کیا بلکہ اشاروں سے کام چلانا شروع کر دیا اور جب بھی بولتے تھے تو الفاظ ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ صورتِ حال یہاں تک پہنچی اور بڑی جلدی پہنچی کہ الفاظ کی ادائیگی تقریباً ناممکن ہو گئی۔ انتہائی کربناک اور تکلیف دہ منظر ہوتا تھا کہ ایک شخص جو شیر کی مانند دکھائی دیتا تھا اور جس کے رعب و دبدبہ کا یہ عالم ہوتا تھا کہ دفتر میں پچاس سے زائد ملازمین کی موجودگی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی اور جس کے ڈر

کی وجہ سے دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے لوگ باقاعدہ پوچھ کر اور اجازت لے کر دفتر کی حدود میں داخل ہوتے تھے، آج بالکل ایک ڈرا ہوا، سہما ہوا، کسی بے دست و پا بچے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

اسی دوران ہیڈ کوارٹر سے ایک آڈٹ ٹیم آئی اور اس نے کچھ اعتراضات لگائے جو مینیجر کے خلاف جاتے تھے۔ یہ اعتراضات جان کر شیخ صاحب مرحوم کی صحت اور خراب ہو گئی۔ کام کرنا بھی مشکل ہو گیا اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ شیخ صاحب کو گھر میں رہنا پڑ گیا۔ اس ناقابلِ برداشت کیفیت کو دیکھ کر جناب نواز خان مرحوم اور اس وقت کے ایڈمنسٹریٹر نے مجھے کہا، 'ہم شیخ صاحب کی ٹرانسفر کے لیے لکھ رہے ہیں، تم ایسا کرو کہ کسی نجی ٹرک والے کا بندوبست کرو تاکہ ان کے گھر کا سامان لاہور بھجوایا جاسکے۔' چنانچہ ایک ہفتے کے اندر اندر شیخ صاحب کے ڈی.جی خان سے لاہور ٹرانسفر کے آرڈرز آئے اور اگست 1998 میں شیخ صاحب کو محکمہ کے ذیلی ادارہ لاہور ٹرانسفر کر دیا گیا۔ شیخ صاحب مرحوم کی جگہ جناب بیگ صاحب پشاور سے آکر مینیجر بن گئے اور یوں تقریباً 10 سال کی مدت ڈی جی خان میں گزار کر شیخ صاحب مرحوم واپس لاہور سنٹر تشریف لے گئے۔

جناب بیگ صاحب ایک منجھے ہوئے، قابلِ رشک صحت کے مالک اور جیالوجی خاص طور پر فیلڈ جیالوجی کے بلاشرکتِ غیرے بے تاج بادشاہ رہے ہیں۔ ایک فقید المثال پراجیکٹ اور اس سے منسلک تمام ذیلی ادارے جناب بیگ صاحب کی دور اندیشی اور فیلڈ جیالوجی میں مہارت کی واضح نشانی ہے۔ یہ وہی پراجیکٹ ہے جس کو

ایک مشکل ایریا کی وجہ سے شیخ صاحب مرحوم شروع نہ کر سکے لیکن ان کے جانے کے بعد بیگ صاحب اور ان کی ٹیم کی شب و روز محنت رنگ لائی اور آج فقید المثال پراجیکٹ اپنی ایک علیحدہ شناخت لیے کامیابی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

بیگ صاحب کو جیالوجی کے علاوہ شعر و شاعری، انشا پردازی، موسیقی اور دوسرے کئی میدانوں میں طبع آزمائی کا بہت شوق رہا ہے اور ان میں سے اکثر میں کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ علاوہ ازیں بیگ صاحب کی حسِ مزاح بھی ان کی شخصیت کا خاصہ رہی ہے۔

ضلع راجن پور میں:

راجن پور کا ایک علاقہ فتح پور بھی ہے۔ وہاں پر خان صاحب اور بھائی جان کے ہمراہ فیلڈ ورک کر رہے تھے کہ بیگ صاحب تشریف لائے۔ زمانہ سستا تھا اور اشیاء وافر مقدار میں تھیں، اس لیے میں اور میرے سینئر افسران اپنے اپنے گھروں کے لیے جو بھی گھر کے استعمال کی چیزیں ملتیں، خرید لیتے۔ اسی دوران بکر عید بھی نزدیک آگئی۔ راجن پور میں گنّے اور دودھ کی بہتات تھی۔ گنّے کی وجہ سے گُڑ بھی بازار میں عام دستیاب تھا۔ ایک دن میں نے بھائی جان سے کہا کہ میں راجن پور بازار جا رہا ہوں، کوئی چیز تو نہیں منگوانی۔ تو بولے، ’ہاں، میرے لیے پانچ کلو گُڑ لے آنا۔‘ ’میرے لیے بھی دس کلو گُڑ لے آنا۔‘ بیگ صاحب کی آواز آئی۔ میں چونکا اور پوچھنا چاہا کہ آپ کی فیملی تو لاہور میں ہے، آپ نے دس کلو گُڑ کیا کرنا ہے؟ لیکن

خاموش رہا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے اور بھائی جان نے پروگرام بنایا کہ راجن پور سے قربانی کے جانور خرید لیتے ہیں اور یہیں سے ڈی جی خان اور پھر لاہور لے جائیں گے۔ تو جب ہم نے تخمینہ لگایا تو پتا چلا کہ سب دوستوں کے بکرے ملا کر دس کے قریب جانور بنتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی بیگ صاحب نے اعلان کیا کہ 'میرے لیے بھی دس بکرے خریدنا۔' ہم چونکے کہ بیگ صاحب نے دس کا پہاڑا ازبر کِیا ہُوا ہے۔ اسی اثناء میں شک پڑنے پر کسی اور چیز کے خریدنے کا ذکر ہوا تو پھر سے بیگ صاحب نے کہا کہ 'میرے لیے بھی دس عدد خرید لانا۔' اب ہماری شرارتی رَگ جاگ اٹھی۔ بھائی خان اونچی آواز میں بولے، 'قریشی صاحب میرے لیے دس کھوتے خرید لو،' اور ساتھ ہی بیگ صاحب کی طرف دیکھا کہ یہاں سے کیا جواب آتا ہے۔ لیکن اب کی بار بیگ صاحب نے خاموشی اختیار کرلی۔ شاید سُنی ان سُنی کر دی۔

جناب بیگ صاحب کُوکنگ کا بھی بہت شوق رکھتے تھے۔ راجن پور سے ایک دفعہ بہترین بیف خریدا اور مَیں بھائی جان کے ساتھ مل کر بیف کڑاہی کے لیے دوسرا سامان تیار کر رہے تھے۔ بیگ صاحب نے کہا، 'اس کو ایسے بنانا ہے اور اس میں یہ یہ چیزیں ڈالنا ہیں۔ بلکہ اس طرح کرو کہ تم دونوں کچن سے باہر چلے جاؤ۔ میں خود بناؤں گا اور سمجھو کہ یہ سرکاری حکم نامہ ہے۔' اور ساتھ ہی کچن کے دروازے پر لکیر لگا دی کہ تم لوگوں نے اس لکیر کو پار نہیں کرنا۔ خیر، کڑاہی اچھی اور لذیذ بنی۔

راجن پور میں پہلے ہی کافی کام مکمل ہو چکا تھا۔ غالباً افضال صاحب، عبدالرشید خان صاحب اور فضل صاحب نے کافی ڈرلنگ وغیرہ کروانی ہوئی تھی لیکن کوئی واضح

امید نظر ئیں آ رہی تھی۔ اب سطحِ زمین پر جو متعلقہ نشانیاں تھیں یا یوں کہیے کہ گوھر مقصود کی موجودگی کے آثار تھے، وہ کلومیٹروں تک پھیلے ہوئے تھے، اور ان کا مخصوص رنگ بھی نمایاں تھا، جو کہ شکار کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے ابتدائی مشاہدات کا سروے ایک بار پھر سے شروع کیا گیا تھا۔ یہاں پر کئی گھاٹیاں اور چڑھائیاں اتنی خطرناک تھیں کہ گرنے یا پھسلنے کی صورت میں بازو یا ٹانگ کا ٹوٹنا بعید از قیاس نہ تھا۔

ایک دن میں سروے کے لیے ایسی ہی ایک تقریباً عمودی چڑھائی پر چڑھ تو گیا لیکن کمزور میٹیریل کی وجہ سے پاؤں بار بار پھسلتا تھا اور مضبوطی کے ساتھ جمتا نہیں تھا۔ اب ہوتا کچھ یوں ہے کہ جب آپ کوئی ارضیاتی مشاہدہ کرتے ہیں اور شکار کی موجودگی کی نشانیاں بھی دیکھتے ہیں تو آپ ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ آپ کو صرف اور صرف ان نشانیوں کا پیچھا کرنے کی ہوش ہوتی ہے اور آپ کے ذہن سے خطرناک پہلو نکل جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی ہوا۔ جب کام کرتے کرتے مجھے محسوس ہوا کہ میرے قدم جم نہیں رہے تو اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے کچھ دیر کے لیے کام سے توجہ ہٹائی، ایسے محسوس ہوا کہ میں زیادہ دیر تک یہاں کھڑا نہیں رہ سکوں گا۔ اور جو اوپر والا مضبوط کنارہ ہے وہاں تک بھی نہیں پہنچ پاؤں گا۔ نیچے کا منظر اور خوفناک نظر آیا۔ نیچے کھائی تھی اور تقریباً ڈیڑھ سو فٹ سے زیادہ گہری۔ میٹیریل نہایت کمزور تھا اور پاؤں پھسل رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار یوں محسوس ہوا کہ اس دفعہ بچنا مشکل ہے کیونکہ اب ٹانگیں بھی ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ اس دوران

خیال آیا کہ گرنا تو لازمی ہے، کیوں نہ سرکاری اشیاء کو ہر ممکن حد تک محفوظ بنا لیا جائے۔ چنانچہ برٹن، برقی آلہ، ہتھوڑا اور نمونے والا بیگ جلدی جلدی اپنے جسم سے جدا کیا اور آہستہ آہستہ نیچے کی طرف لڑھکانا شروع کیا۔ ساتھ ہی چٹان نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اور منہ سے کلمہ شریف کا بلند آواز میں ورد کرتا ہوا آناً فاناً نیچے لڑھک گیا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ بندے کی خوب حفاظت کرتے ہیں۔ میں پھسلتا رہا اور بچوں کے پھسلنے والے کھیل کی طرح تقریباً چند سیکنڈوں میں بالکل نیچے ڈھلوان کی طرف سفر مکمل کرتا ہوا ایک خالی نالے کے وسط میں گر گیا۔ گرنے کے بعد دو منٹ تک اپنے تمام اعضا چیک کیے، الحمدللہ ماسوائے چند ایک قابلِ برداشت خراشوں کے سارا کچھ ٹھیک تھا۔

بھائی جان نزدیک ہی تھے۔ ان کو صورتِ احوال کا قطعاً اندازہ نہ تھا۔ وہ حسبِ معمول نارمل حالت میں بولے، 'اوئے قریشی، یہاں کیا کر رہے ہو؟' میں نے بھی اپنی داستان سنانے کی کوشش نہیں کی۔ خوش قسمتی سے سرکاری آلات جو خود سے الگ کیے تھے، وہ بھی نزدیک ہی سے دستیاب ہو گئے۔ دوبارہ انھیں اپنے جسم کے ساتھ لگایا اور کام میں مصروف ہو گیا۔

ضلع راجن پور کے پہاڑی علاقوں میں تقریباً پچاس کلو میٹر کی لمبائی میں ایک پٹّی تھی، جس میں ہم لوگ کام کر رہے تھے۔ شروع میں یعنی شمالی حد پر جگر چُر ڈگر چُر دو نالے تھے اور پھر جنوبی طرف سوری نالہ تھا۔ اس کے درمیان میں شیز گی نالہ

بھی پڑتا ہے۔ یہ سارا علاقہ تقریباً سنسان اور بے آباد ہے۔ یہاں کے ندی نالے موسمی ہیں، جب کبھی بارشیں ہوتی ہیں تو ان میں پانی کا بہاؤ آتا ہے۔ اس لیے سبزہ بھی بہت کم کم ہے۔ آبادی زیادہ تر راجن پور کا جو مڈ فلیٹ ہے، وہاں پر ہے اور اس کے بعد اکادکا مکان نظر آتے ہیں۔ ہمارے کیمپ سے یہ مڈ فلیٹ تقریباً ساٹھ کلومیٹر چوڑا ہے اور اس کے بعد 'فاضلہ کچھ' کے آگے ہمارا فیلڈ ایریا شروع ہوتا ہے۔

روزانہ ڈبل کیبن میں جناب خان صاحب کی زیرِ قیادت مَیں، بھائی جان، سرویئر حضرات اور ایک آدھ فیلڈ قلی اس فیلڈ ایریا میں کام کیے جاتے تھے۔ ایک دن فیلڈ ایریا جگر چُر سے بیس کلومیٹر پہلے کچھ مقامی لوگ راستے میں ملے اور گاڑی رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی رکنے پر خان صاحب کو کہنے لگے کہ ہمارے ہاں ایک فوتگی ہو گئی ہے اور ہمارے علاقے میں کوئی مسجد یا مولوی نہیں ہے تو آپ اس کا جنازہ پڑھا دیں۔ خان صاحب کہنے لگے کہ ابھی تو ہم کام پر جا رہے ہیں اور راجن پور کوئی اتنا دور بھی نہیں تو آپ کسی طرح سے راجن پور سے مولوی صاحب کو لے آئیں اور جنازہ پڑھوا لیں یا ہماری واپسی کا انتظار کر لیں۔ چنانچہ ہم لوگ روزمرہ کا کام کر کے واپس آ رہے تھے کہ جنازہ کے ساتھ ہی وہ لوگ ہمیں مل گئے اور تقریباً شام کے وقت خان صاحب نے جنازہ پڑھایا۔ ہمیں بڑی حیرانی ہوئی کہ انھوں نے ابھی تک نہ تو میّت دفنائی اور نہ ہی انھیں کوئی مولوی صاحب ملے، جو بر وقت اتنا ضروری مذہبی فریضہ ادا کرتے۔

تقریباً 12500 مربع کلومیٹر کے اس علاقے میں اوّل تو پانی دستیاب ہی نہیں،

البتہ بارشوں کے دنوں میں کچھ جوہڑوں میں پانی اکٹھا ہو جاتا ہے جس کو علاقے کے لوگ اور جانور مشترکہ استعمال کرتے ہیں۔ اگر کھدائی کر کے کنواں بنایا جائے تو سخت کڑوا پانی نکلتا ہے جو پینے کے قابل نہیں ہوتا۔ بھوک اور پیاس انسانوں اور جانوروں کے لیے یہاں سخت ترین امتحان ہے۔ اگر کوئی انسان یا جانور غلطی سے راستہ بھٹک جائے تو اس کی قسمت ہی ہے کہ زندہ بچ جائے، ورنہ۔۔۔!

یونہی ایک دن ہم کام پر جا رہے تھے کہ راستے میں ایک کُتا نظر آیا جو بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ یاد رہے کہ مڈ فلیٹ میں آپ کو بہت زیادہ راستے ملیں گے، جو عرب شہزادوں کی جیپوں کی وجہ سے بنتے ہیں، جب وہ یہاں تلور کا شکار کرنے آئے ہوتے ہیں۔ اس لیے ڈرائیونگ بڑے دھیان سے کرنا پڑتی ہے کہ کہیں اصل راستے سے بھٹک نہ جائیں اور پھر سارا سارا دن آپ اپنی منزلِ مقصود کی طرف جانے کے لیے پریشان رہتے ہیں۔ ہم میں کسی کو اندازہ نہیں ہوا کہ یہ جانور آہستہ آہستہ چل رہا ہے تو اس کا پیاس وغیرہ کا مسئلہ نہ ہو۔ واپسی پر اسی جگہ وہ کُتا مرا ہوا پڑا ملا۔ بے چارا بھوک پیاس برداشت نہ کر پایا اور نہ ہی کسی نے اس کی مدد کی۔ اس کا اس طرح سرِراہ تڑپ تڑپ کر جان دینا دل کو دُکھی کر گیا۔ اس کے بعد ہم نے کبھی بھی کسی جانور کو خاص طور پر کُتے کو بغیر پانی دیے نہیں چھوڑا۔

ایسے علاقے میں فیلڈ ورک کرنا بھی بہت بڑا جہاد تھا۔ جب آبادی کوئی نہیں تو افرادی قوت کہاں سے میسر آتی؟ لے دے کے یہاں پر قانون سے بھاگے ہوئے مفرور تھے یا ڈاکو۔ خان صاحب نے انھی کو بھرتی کر لیا اور قانونی تقاضے پورے

کرنے کے لیے دفتر سے اجازت بھی لے لی۔ یہ لوگ کافی فائدہ مند ثابت ہوئے۔ ایک تو ان کی مالی معاونت ہو گئی دوسرا ہمیں سیکیورٹی کا کوئی مسئلہ نہ رہا۔ کیونکہ ان تمام لوگوں کے پاس اسلحہ ہوتا تھا۔

راجن پور کے اس علاقے میں بے انتہا سانپ پائے جاتے تھے یہاں تک کہ کئی دفعہ کوبرا بھی نظر آئے، لیکن زیادہ مڈ بھیڑ نہیں ہوئی۔ ویسے بھی کوبرا بہت دہشت رکھتا ہے۔ البتہ دوسری نسلوں کے سانپ جیسے ہی نظر آتے، ہم ان پر پل پڑتے اور مار کر ہی دم لیتے۔ میرا نشانہ کافی اچھا تھا اور میں پتھر سے نشانہ لے کر سانپ کو مار دیتا تھا۔ پہلے اس کو زخمی کرتا، جب وہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا پھر اس کے سر پر پتھر مار کر اس کو مار دیتا۔ مقامی لوگ بہت حیران ہوتے تھے کیونکہ وہ سانپ کو لاٹھی سے مارنے کا فن جانتے تھے۔ میری قوتِ سماعت بھی کافی تیز تھی۔ دُور سے کوئی جیپ یا گاڑی آرہی ہوتی تو مجھے اس کی گڑگڑاہٹ محسوس ہو جاتی تھی اور میں مقامی افراد کو بتا دیتا کہ گاڑی آرہی ہے۔ قوتِ بصارت بھی تیز تھی، اس لیے کوئی بھی سانپ فوراً نظر آجاتا۔ یہ سانپ اپنے ماحول کے مطابق وہی رنگ روپ لیے ہوتے ہیں جو اُن کے اردگرد پتھروں یا چٹانوں کا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر سانپ حالتِ سکون میں ہوتا تو اسے شناخت کرنا کافی مشکل کام تھا لیکن قدرتی طور پر مجھے ان کی موجودگی کا اندازہ ہو جاتا تھا اور میں ان کا کام تمام کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ ان اوصاف کی وجہ سے مقامی لوگ اکثر مجھے کہتے تھے کہ 'تم بھی ہمیں بلوچ لگتے ہو، پنجابی ہرگز نہیں۔'

سانپوں کا ذکر چلا ہے تو ایک نہایت دلچسپ اور حیران کن واقعہ بتاتا چلوں اور

ساتھ ہی یہ بھی حقیقت کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہو تب تک نہ تو کوئی انسان کو نفع پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی نقصان۔ فیلڈ ورک بہت تھکا دینے والا عمل ہے ایک دن جناب خان صاحب اور ہم لوگ فیلڈ ورک مکمل کر کے تقریباً دوپہر 3 بجے فارغ ہو گئے اور تھکاوٹ سے چور چور اپنے اپنے خیموں میں آرام کی غرض سے چارپائیوں پر گر گئے۔ خان صاحب چارپائی پر نہ لیٹے بلکہ ٹینٹ میں بچھی ہوئی دری پر ہی لیٹ گئے۔ تقریباً 1 گھنٹہ سے زیادہ ستانے کے بعد عصر کی نماز کے وقت تقریباً ساڑھے چار بجے اٹھے اور اپنی شلوار کو سیدھا کرنے لگے۔ اسی اثناء میں خان صاحب کو غیر معمولی حرکت محسوس ہوئی جو کہ انتہائی دہشت ناک قسم کی تھی مجیب صاحب کو فوری طور پر کسی موزی کی موجودگی کا احساس ہوا اور انہوں نے آناً فاناً شدید پریشانی کی حالت میں شلوار اتار دی۔ جیسے ہی شلوار اتری اور ایک گز لمبا سانپ برامد ہوا اور تیزی سے ٹینٹ سے باہر نکل گیا۔ رونگٹے کھڑے کرنے والی بات تو یہ تھی کہ ناجانے یہ موزی خان صاحب کی شلوار میں استراحت کر رہا تھا اور اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوئی کہ کوئی گزند نہ پہنچا سکا۔ اس واقعہ کے بعد بھی کافی دنوں تک دہشت طاری رہی۔

بھائی جان مقامی لوگوں کی نفسیات سے بخوبی آشنا تھے۔ ان لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے کی کوششوں میں ایک کوشش یہ بھی تھی کہ ہم اکثر و بیشتر راجن پور شہر سے چائے کی پتّی، چینی، گُڑ، گھی، خشک دودھ اور دوسرا راشن لے آتے اور ان کو استعمال کے لیے دیتے۔ وہ بھی بہت خوش ہوتے اور اس طرح ایک بہترین تعلق استوار ہو گیا جو ہمارے مشکل فیلڈ ورک میں کام آیا۔

راجن پور کے علاقے میں ایک اور بڑی دلچسپ بات ہے۔ علم نہیں کہ اب بھی ویسا ہے یا نہیں لیکن ایک دفعہ مَیں، طاہر عابد مرحوم، ان کے سسر خورشید خان مرحوم، شیخ صاحب مرحوم اور صحبت خان ڈرائیور غالباً شیند گی یا سوری نالے میں فیلڈ ورک کے لیے جا رہے تھے اور علاقہ کی راہنمائی کے لیے طاہر عابد مرحوم اور ان کے سسر خورشید مرحوم ساتھ تھے۔ یہ غالباً دسمبر یا جنوری کے مہینے کی بات ہے۔ جب ہم ان نالوں کی چھوٹی شاخوں کے نزدیک پہنچے تو ہم نے کچھ جھاڑیوں اور کچھ بڑے درختوں کو بالکل سفید رنگت میں دیکھا۔ دُور سے ایسا لگتا تھا جیسے ان پر برف جمی ہوئی ہو۔ خورشید خان مرحوم نے یہاں ایک یکتا پراسیس کا ذکر کیا کہ یہ برف نہیں بلکہ چینی کی طرح کی کوئی چیز ہے اور ذائقہ میں بھی بالکل چینی کی طرح میٹھی ہے۔ مقامی لوگ مجھے ہر سال یہ چینی اکٹھی کر کے بھیجتے ہیں۔ میں چونکہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہوں، اس لیے اس چینی کو گلے کی خراش کے لیے اور دوسری دوائیوں کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ اسی اثناء میں ہم ان جھاڑیوں اور درختوں کے پاس پہنچ گئے اور مشاہدہ شروع کر دیا۔ چینی کے گچھے بالکل کرسٹل (قلموں) کی طرح لٹکے کے ہوتے تھے اور تقریباً تقریباً سارے پودے پر امر بیل کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے قلموں کو پتوں سے جدا کر کے چکھا تو بالکل چینی کی طرح ذائقہ محسوس ہوا۔ میں نے کافی زیادہ مقدار میں میٹھی قلمیں اکٹھی کر لیں اور دفتر میں دوسرے ساتھیوں کو دکھانے کے لیے کچھ شاخیں، جن پر قلمیں لگی ہوئی تھیں، کاٹ کر گاڑی میں رکھ لیں۔ ایک اور معلوماتی بات یہ تھی کہ یہ جھاڑی نما درخت پورے ڈسٹرکٹ

ڈی.جی خان اور راجن پور میں پایا جاتا ہے لیکن اس پر چینی یا میٹھی قلمیں صرف ان نالوں میں اُگے ہوئے درختوں پر بنتی ہیں۔

یہ بات تو طے تھی کہ سردیوں کے موسم میں جو شبنم رات کو درختوں پر پڑتی ہے، وہ قدرتی طور پر میٹھی چینی میں بدل جاتی ہے۔ لیکن چینی کا میٹیریل اور وہ عمل کون سا ہے جو اس پُراسرار پراسیس میں عمل دخل رکھتا ہے۔ یہی سوال جناب خورشید مرحوم سے پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ میں نے اس کا لیبارٹری تجزیہ کروایا ہے جس کے مطابق اس چینی کا کیمیائی فارمولہ وہی ہے جو گنے سے تیار کی گئی چینی کا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا پراسیس کیا ہے، یہ پتا نہیں چل سکا۔ ایک اور تجزیے کے مطابق کوئی تابکاری شعاعیں بھی اس عمل کا حصہ بنتی ہیں۔ ہم سمجھ گئے کہ ان نالوں کے مغرب میں طابکاری عمل کی نشانیاں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہوا کے ساتھ کچھ تابکاری شعاعیں یا ذرّات شبنم گرنے کے عمل کے دوران معاونت کرتے ہوں اور چینی بننے کا عمل ہوتا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب! بعد میں جناب مظہر صاحب نے بھی ان جھاڑیوں اور درختوں کا معائنہ کیا اور انھوں نے بھی چینی کی قلموں کا ذکر کیا۔

ضلع راجن پور میں کام کرتے ہوئے بے حد عجیب واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ شروع شروع میں ہم نے بنگلہ ہدایت میں پڑاؤ ڈالا۔ ابھی فیلڈ کا سامان بلکہ کچن کے برتن بھی نہیں سمیٹے تھے کہ جناب بیگ صاحب اور نواز صاحب تشریف لے آئے اور اسی کچی بھُنی حالت میں کہنے لگے، کہ 'صبح ہم سب سوری نالہ جائیں گے!'

سوری نالہ مشہور و معروف بگٹی قبائل کی حدود میں آتا ہے اور نہایت خطرناک

علاقہ متصور ہوتا ہے۔ یہاں لوگ خاص طور پر غیر مقامی افراد بالکل بھی محفوظ نہیں۔ ہم نے عرض کیا، 'سر ذرا سانس لینے دیں۔ ایک دو دن بعد ان شاء اللہ سوری نالے کی طرف مارچ کریں گے۔' لیکن بیگ صاحب بولے، 'نہیں؛ کل اکٹھے چلیں گے اور ہم کل شام کو واپس ڈی جی خان جائیں گے۔ بعد میں آپ لوگ تفصیلی فیلڈ کرتے رہیں۔'

لہٰذا ہم لوگ کیمپ کے دوسرے معاملات کے لیے راجن پور شہر گئے۔ جب واپس آئے تو بیگ صاحب اور نواز صاحب کہنے لگے، 'یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ سوری نالے میں بعد میں جائیں گے، پہلے آپ لوگ محفوظ مقام پر کیمپ شفٹ کر لیں۔' استفسار کے بعد معلوم ہوا کہ ہماری غیر موجودگی میں اور بیگ صاحب اور نواز صاحب کی موجودگی میں بنگلہ ہدایت کے بالکل سامنے سڑک پر کچھ مقامی لوگوں نے یہاں کے ڈی ایس پی کے ساتھ ہاتھا پائی کی اور اس ڈی ایس پی کا ناک چبا ڈالا جو کہ بہت بے عزتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ فوراً کوٹ مٹھن کی طرف ڈھینگن بنگلے والی سمت گئے، وہاں معاملات طے کیے اور اگلی صبح بنگلہ ہدایت سے ڈھینگن بنگلہ میں شفٹ ہو گئے۔

ڈھینگن بنگلہ کی اپنی شاندار روایات ہیں۔ یہاں پر سینکڑوں سال پرانے چالیس پچاس آم کے درخت لگے ہوئے ہیں اور ان درختوں میں سینکڑوں کی تعداد میں طوطے رہتے ہیں۔ تقریباً ہر شاخ کے ساتھ سبز رنگ کے طوطے آپ کو جھولتے نظر آئیں گے۔ یہ کب سے ایسا ہے، مقامی لوگ بھی ٹھیک سے نہیں جانتے۔

بہر حال جیسے ہی عصر کا وقت ہوتا ہے، ان طوطوں کے شور شرابے کی وجہ سے کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی اور جیسے ہی مغرب کا وقت ہوتا ہے، یہ شور شرابہ ختم ہو جاتا ہے۔ ڈھینگن بنگلہ سے جگر چُر اور ڈگر چُر آنے جانے کا فاصلہ تقریباً 140 کلومیٹر بنتا تھا اور وقت بھی بہت ضائع ہوتا تھا، اس لیے ہم کافی عرصے سے اس تلاش میں تھے کہ ہمیں ہماری سائیٹ کے نزدیک کیمپ کے لیے کوئی جگہ مل جائے۔

چنانچہ فتح پور میں ایئر فورس والوں کا ایک ایئر بیس ہے، جہاں جناب خان صاحب کی کچھ تگ و دو سے ہمیں کیمپ کے لیے جگہ مل گئی۔ یہاں ایئر بیس کا انچارج بہت اچھی طبیعت کا مالک تھا اور ساتھ ہی مذہبی لگاؤ بھی رکھتا تھا۔ وہ ہماری آمد پہ بہت خوش ہوا کیونکہ یہاں پر رونق ان دنوں ہوتی ہے جب کوئی مشقیں ہو رہی ہوں، ورنہ سارا سال یہ بیس کیمپ خالی رہتا ہے۔

ہم نے جناب بیگ صاحب سے اجازت لی اور اپنی اپنی فیملیز بھی اس کیمپ میں لے آئے۔ اس سے اور رونق بڑھ گئی اور ایک دن بیس کیمپ کے انچارج نے ہماری دعوت بھی کی۔ اچھا خاصا ماحول بن گیا تھا۔ دن کے وقت ہم لوگ فیلڈ پر کام کرتے جو بمشکل 20 کلومیٹر رہ گیا تھا اور باقی شام کا وقت اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ گزارتے۔ اس وقت تک خان صاحب کے بھی تین بچے تھے یعنی لیث، نظار اور ایک بیٹی اور اسی طرح میرے بھی تین بچے بالترتیب حفصہ، محمد بلال اور مطاہر جمال۔ تقریباً دس یا پندرہ دن کے بعد ہم لوگوں نے اپنی اپنی فیملیز کو واپس ڈی جی خان میں بھیج دیا اور ایک بار پھر کام میں مصروف ہو گئے۔

والد صاحب کا انتقال:

یہ 7 جنوری 1999 کی صبح تھی۔ وہی روٹین والی زندگی چل رہی تھی۔ نمازِ فجر کے بعد ہم لوگوں نے ناشتہ کیا اور فیلڈ کے لیے تیار ہو گئے۔ دن شروع ہی سے بوجھل سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں پہلے کی طرح تازہ دم نہیں تھا۔ کوئی ان جانا سا بھاری احساس تھا لیکن خاص توجہ نہ دی۔ حسبِ معمول تیاری میں تھا۔ یہاں تک کہ فیلڈ سائٹ آ گئی۔ آج ہم نے ابتدائی مشاہداتی سروے کرنا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ وہی سائٹ، وہی پہاڑ، وہی ہر چیز۔ موسم بھی خوش گوار تھا لیکن میرے قدم اس سرعت کے ساتھ نہیں اُٹھ رہے تھے جن کا میں عادی تھا۔ ٹانگیں بھاری بھاری محسوس ہو رہی تھیں اور یوں سمجھیں کہ کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میری اس کمزوری کو بھائی جان نے بھانپ لیا اور پھبتی کسی، کہ قریشی رہ گیا ہے' یعنی اب بوڑھا ہو گیا ہے، اس لیے سُست لگ رہا ہے۔ میں نے کہا، 'نہیں سر، کچھ بھی نہیں، بس ویسے ہی ایک پژمردگی سی چھائی ہوئی ہے۔' میں خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ تقریباً دن کے دس بج رہے تھے جب یہ کیفیت اپنے عروج پر تھی۔ بہر حال جیسے تیسے پورا دن کام میں گزارا اور کچھ خرید و فروخت کے لیے کیمپ کی بجائے راجن پور بازار چلے گئے۔ ایک مناسب جگہ پر اپنی سرکاری جیپ کھڑی کی اور بازار میں خریداری شروع کر دی۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور پوچھنے لگا: ”یہ گاڑی محکمہ والوں کی ہے؟“

ہم نے جب ہاں کی تو پوچھنے لگا، ”آپ میں محمد عباس صاحب کون ہے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا، ”میں ہوں۔ خیریت تو ہے؟“

وہ بولا، ”آپ اپنے گھر لاہور فون کر لیں۔“

دل دھڑکا، پریشانی لاحق بھی ہوئی، بہرحال بھائی جان ساتھ تھے۔ پاس کی ایک ٹیلی فون ایکسچینج سے گھر فون کیا تو میرا بھانجا عاکف دوسری طرف رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ نانا جان اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک دم ایسے لگا جیسے میرے سر سے کوئی چھت نکل گئی ہو اور میں ننگا ہو گیا ہوں۔ بہرحال والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ یہ یقین ہو گیا کہ عباس صاحب دعاؤں کی ایک مشین بند ہو گئی ہے اور وہ ہستی جس نے اپنی سمجھ بوجھ سے اس محکمہ کی نوکری بحیثیت ڈیلی ویجر قبول کرنے کی صلاح دی تھی، اپنا فرض بہترین طریقے سے مکمل کر کے اپنے آخری سفر کو روانہ ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی آج کے دن کی پُراسراریت اور غیر معمولی بھاری بھر کم دن کے آغاز سے لے کر اس خبر کے سننے تک سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ (انا اللہ وانا الیہ راجعون!)

گہری دھند والی راتیں تھیں، بیگ صاحب کی مہربانی سے سرکاری گاڑی ریکوزٹ ہو گئی اور میں نے اپنی فیملی کو لے کر لاہور کی طرف روانگی شروع کی۔ رمضان شریف کی 17 تاریخ تھی جس روز دن کے 11 بجے والد صاحب نے رحلت فرمائی۔ لاہور جا کر ان کی تدفین کی اور تقریباً ایک ہفتے کے بعد واپس فتح پور کیمپ میں رپورٹ کی۔

تقریباً ایک ماہ اور چند دن کے بعد ڈی.جی خان سے ذیلی ادارہ لاہور ٹرانسفر کا لیٹر ملا اور یکم مارچ کو اس نئے آفس میں جوائننگ رپورٹ جمع کروادی۔ یوں کُل مدت جو ڈیلی ویجر سے لے کر سینئر جیالوجسٹ تک کی تھی، وہ کم و بیش 14 سال کی رہی۔ جناب نواز صاحب مرحوم کہتے رہے کہ ’عباس، نہ جاؤ، یہیں کہیں تمھیں کوئی پراجیکٹ دے دیں گے۔ تم نے بہت محنت کی ہے اور اب اس محنت کے ثمرات وصول کرنے کا وقت ہے۔‘ لیکن میری جذباتی کیفیت پژمردگی کا شکار ہو گئی تھی۔ ایک تو والدِ محترم میری راہ تکتے تکتے اللہ کو پیارے ہو گئے اور دوسرا والدہ محترمہ کی بیوگی اور تنہائی کا خیال دل میں کچوکے لگاتا تھا، اس لیے ان سے معذرت کی اور ڈی.جی خان سے لاہور آ گیا۔

یہاں والد صاحب کے ترکہ کے سارے معاملات سنبھالے اور جہاں جہاں جو جو ترکہ پڑا تھا، سمیٹا اور تمام بہن بھائیوں کی رضامندی سے والدہ کے نام پر ٹرانسفر کیا۔ پھر کچھ برس بعد والدہ کی رضامندی سے تمام بہن بھائیوں میں وہ ترکہ شرعی طور پر تقسیم کر دیا۔ سب راضی و خوش ہوئے اور مکان، جس میں والدہ کے ساتھ ہم تین بھائی رہائش پذیر تھے، وہ رہ گیا اور بعد میں 2014 میں وہ بھی فروخت کر کے اس کی شرعی تقسیم کر دی۔ یہ کام اللہ تعالیٰ نے میرے ذمے لگایا تھا اور پھر خود ہی مدد کر کے مجھے سرخرو بھی کیا۔

باب دوم

ذیلی ادارہ لاہور میں

ڈی جی خان سے لاہور تبادلہ:

ڈی جی خان سے لاہور تبادلہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ہم سب لوگ جو ڈی جی خان میں مختلف پراجیکٹس پر کام کر رہے تھے، ہر وقت اس کوشش میں ہوتے کہ یہاں سے ٹرانسفر کروا کے لاہور، کراچی، پشاور، یا اسلام آباد چلے جائیں۔ لیکن کچھ تو غیر معمولی اور خاص قسم کا کام اور پھر محکمے کے پروگرام کو کامیاب کرنے کا جنون، ہم میں سے کوئی کوئی سپیشل کیس ہی ٹرانسفر کے لیے منظور ہوتا تھا، باقی سارے واپس ہو جاتے تھے۔ اسی دوران ایک ایسا عظیم الشان دن آگیا جب ملک و قوم اور پاکستان نے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کی اور اپنے خوابوں کی تعبیر پا کر اپنے روایتی دشمن کے گھٹنے ٹیک دیئے۔

اس عظیم الشان کامیابی کے ساتھ ہی ڈی جی خان اور دوسرے غیر معمولی اور خاص پراجیکٹس میں ٹرانسفر کے بندھن آہستہ آہستہ ڈھیلے پڑنے شروع ہوئے اور

پھر غالباً ستمبر یا اکتوبر ۱۹۹۸ میں ہیڈ کوارٹر اسلام آباد سے ایک اجازت نامہ جاری ہوا جس کی بابت ایک خاص مدت سے زیادہ عرصہ ہارڈ ایریا میں رہنے والے اب سافٹ ایریا میں ٹرانسفر کے لیے اپلائی کر سکتے تھے۔ میں نے، جونئیر بٹ صاحب اور ارشد صاحب نے فوراً اپلائی کر دیا اور بعد میں حسن صاحب نے بھی۔ اس طرح فروری ۱۹۹۹ میں میری اور جونئیر بٹ صاحب کی ٹرانسفر ذیلی ادارہ لاہور، ارشد صاحب کی ذیلی ادارہ کراچی اور حسن صاحب کی ٹرانسفر ہیڈ کوارٹر میں ہو گئی۔

یکم مارچ ۱۹۹۹ کو میں ذیلی ادارہ لاہور میں حاضر ہوا تا کہ نئی ذمہ داریوں کے لیے جوائن کروں۔ وہاں بڑا دلچسپ سین ہوا۔ میں جب دفتر کے راستے میں گراؤنڈ کے نزدیک پہنچا تو جناب ناصر صاحب جو اس وقت ہیڈ سروے ڈویژن کے طور پر کام کر رہے تھے، سامنے سے آتے ہوئے اپنی روایتی ملنساری کے برخلاف مجھے پوچھتے ہیں، بھائی میاں کہاں؟ میں نے عرض کیا: سر جناب سینئر بٹ صاحب جو کہ ہیڈ ایکسپلوریشن سروے تھے ان کے پاس جوائن کرنے جا رہا ہوں۔ فوراً بولے، کوئی ضرورت نہیں میں نے بات کر لی ہے۔ تم مجھے سروے ڈویژن میں جوائن کرو گے۔ چنانچہ مجھے میرے بازو سے پکڑا اور سروے ڈویژن میں لے گئے۔ اشرف صاحب نے میری جوائننگ کی تو ذیلی ادارہ لاہور کے لیے کی تھی، بعد میں میرے آرڈر فیلڈ سروے ڈویژن کے لیے کر دیے۔ بمشکل ایک یا دو دن کے بعد ناصر صاحب نے اپنے کمرے میں بلایا اور ایک عدد ٹوور آرڈر اور ساتھ لاہور سے ڈی جی خان کے لیے ایئر ٹکٹ ہاتھ میں تھمایا اور حکم صادر کیا کہ آپ کل ہی ڈی جی خان چلے جائیں، وہاں

گاڑی آئی ہو گی جو آپ کو وہوا کے لیے لے جائے گی۔ وہوا تونسہ کے نزدیک ایک قصبہ ہے۔ میں ذرا بجھ سا گیا کہ ابھی تو ڈی جی خان سے آیا ہوں اور پھر وہیں۔ لیکن نوکری میں اپنی مرضی نہیں چلتی، چنانچہ گھر آکر فیلڈ کا سامان اکٹھا کیا اور اگلے دن ڈی جی خان کے ایئرپورٹ پر تھا، وہاں جمشید ڈرائیور جیپ لے کر آیا ہوا تھا۔ جیپ میں سوار ہوا اور تقریباً تین ساڑھے تین گھنٹے میں وہوا کے سروے کیمپ میں پہنچ گیا۔ وہاں پر اظہر صاحب پیدل سروے کیمپ کے انچارج تھے اور جناب ملک صاحب جیوکیمسٹری کے انچارج۔ ساتھ میں جناب منہاس صاحب اور بعد میں محمود صاحب بھی تشریف لے آئے۔ صدیق صاحب فیلڈ ہیلپر تھے اور آٹھ دس کے قریب برقی آلات لائن میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں آکر ایک بڑی تبدیلی نظر آئی۔ ڈی جی خان کیمپ میں ہم خود یعنی آفیسرز برقی آلہ چلاتے تھے، لیکن لاہور کے کیمپ میں اس کام کے لیے باقاعدہ فیلڈ ہیلپر بالعموم ڈیلی ویجر بھرتی کر لیے جاتے تھے۔ صرف ایک مستقل فیلڈ ہیلپر تھا، ہر کیمپ میں۔ اور یہاں کے مستقل فیلڈ ہیلپر جناب صدیق صاحب تھے۔

میں چونکہ برقی آلہ اپنی کمر کے ساتھ لگا کر اس کو استعمال کرنے کا عادی تھا، اس لیے میں نے بغیر آلہ کے فیلڈ میں جانا پسند نہ کیا اور صدیق صاحب سے ایک آلہ لے کر باقاعدہ اپنی کمر کے ساتھ باندھا۔ برنٹن بیلٹ میں پھنسایا اور ہیمر ہاتھ میں پکڑ لیا اور کہا چلو اب سائیٹ پہ چلیں۔ صدیق صاحب تھوڑا حیران ہوئے، لیکن سوائے ایک جملہ کے آپ کے بارے میں کافی کچھ سن رکھا ہے۔۔۔ کوئی اور بات نہ کی اور

گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سارادن دھوپ میں ٹانگیں چلائیں اور تھوڑادکھ سا محسوس کیا کہ اچھا بھلا ڈی جی خان میں کرسی میز والی نوکری جو شروع ہو گئی تھی، اس کو چھوڑ کر یہاں پھر چودہ سال پہلے والی مشقت اور وہی پسینہ بہانا، لیکن اللہ نے ہمت دی اور بہادری سے سہہ گیا۔

کچھ دنوں ایسے ہی سائیٹ پر جاتے رہے اور جلد ہی میرے برقی آلہ نے ریڈنگ ریکارڈ کرلی اور یوں ذیلی ادارہ لاہور کی طرف سے پہلی کامیابی ریکارڈ ہو گئی۔ صدیق صاحب بہت خوش ہوئے اور ویسے بھی تقریباً ایک ہفتہ سے چونکہ اکٹھے کام کر رہے تھے اور میں نے جناب شیخ صاحب مرحوم سے کافی کچھ سیکھ رکھا تھا۔ خاص طور پر دل لگا کر محنت سے کام کرنا تو جب برقی آلہ چلایا تو وہ مجھ سے کافی خوش ہوئے اور بعد میں اکثر کہتے رہتے کہ آپ کے متعلق جو سنا تھا ویسا ہی پایا۔

چند دنوں کے بعد جناب منہاس صاحب کے ساتھ سروے کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ موصوف نے ایک دن وہوا کے پورے سیکشن کو ریکارڈ کرنے کا پروگرام بنایا اور ہم لوگ سروے کے سامان لیکر سارا سیکشن کھنگالنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ کبھی رک جائیں، کبھی پانی پینے کے لیے ستائیں۔ پھر اُٹھیں کام کریں، دوپہر کا کھانا کھایا اور ظہر کی نماز ادا کی۔ تازہ دم ہونے کے بعد پھر سروے شروع کر دیا۔ یوں کرتے کرتے ساری فارمیشن ریکارڈ کرلی اور آگے میرین سیکشن شروع ہو گیا۔ وہاں پر پہنچے، جسم کی انرجی اور قوت قریب قریب ختم ہو گئی تھی اور ہم نے عصر کی نماز بھی پڑھ لی تھی۔ یہاں بمشکل ایک گلاس پانی پیا اور پھر واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن واپسی

کوئی ڈیجیٹل تو نہیں تھی اس کے لیے بھی ٹانگوں اور پاؤں سے کام لینا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مغرب ہو گئی۔ نماز پڑھی اور پھر واپسی شروع۔ اندھیرا چھا گیا، خوش قسمتی سے ابتدائی چاند راتیں تھیں اس لیے ٹھوکریں کھانے سے بچ گئے۔ سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بہر حال گرتے پڑتے جب اپنی منزل کے قریب پہنچے تو اظہر صاحب مع گاڑیوں کے وہاں موجود تھے۔ ہمیں دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا اور اگلے ہی لمحہ شدید طرح ڈانٹ بھی پلا دی اور منع کر دیا کہ آیندہ اس طرح یہ کام نہیں کرنا۔

بعد میں منہاس صاحب بولے کہ قریشی صاحب آپ کے بارے میں ہم نے سن رکھا تھا اس لیے آپ کو چیک کرنے کے لیے یہ ٹوٹل 28 کلو میٹر کا ٹریورس لگایا ہے۔ میں سوچ میں پڑھ گیا کہ یہ کیسا عمل ہے۔ آدمی کی شہرت اس کے پہنچنے سے پہلی ہی پہنچ جاتی ہے۔ شہرت اچھی ہو یا بری ہو۔ بہر حال قدرت نے کامیابی عطا کی اور منہاس صاحب نے اپنا ٹرائل مکمل کر لیا۔

ہمارا کیمپ یہاں پر بھی ایک ہسپتال کے رہائشی حصہ میں تھا۔ چونکہ رہائش تو تھی نہیں اس لیے اس کی حالت کوئی اتنی تسلی بخش نہیں تھی۔ ہم نے خود ہی ضرورت کے مطابق کوئی ضروری مرمت وغیرہ کر لی تھی، اس لیے رات کو ہوا چلنے کی صورت میں اکثر چوں چراں کی آوازیں آتی تھیں۔

جناب منہاس صاحب رات کو اکثر انتہائی خوفناک انداز میں اٹھ جاتے اور کبھی غمگین انداز میں تقریباً رونے والی آواز میں چلاتے کہ پکڑو، پکڑو۔ مجھے بچاؤ اور

کبھی انتہائی غصیلے انداز میں کاشن دیتے۔ پہلے پہل تو میں بہت ڈرا اور سہا کہ جس انداز میں ان کو دورہ پڑتا ہے یہ تو ساتھ سوتے ہوئے دوسرے شخص کا گلا بھی گھونٹ سکتے ہیں۔ اس کا تذکرہ جب میں نے ظفر صاحب سے کیا تو انھوں نے کہا ہاں، اس کے ساتھ مسئلہ ہے۔ یہ جب ایسا کرے تو آپ اسے کہا کریں کہ ٹھیک ہے اب تم کروٹ بدل لو۔ تو ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے پہل وہ بھی ایسے ہی مسئلہ سے دوچار ہو چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے مجھے اس کا علاج بتادیا۔

جناب منہاس صاحب چکوال کے ایک نزدیکی قصبہ کے رہنے والے ہیں۔ انتہائی نفیس اور مہنگا، جدید، بہترین تراشا ہوا لباس اور کافی سے زیادہ خوشبوات اور کریموں کا استعمال کرنے کے عادی رہے ہیں۔ گفتگو میں اتنا عبور، اتنی مہارت سے خوبصورت الفاظ کا چناؤ اور استعمال کہ اگلا فورا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اپنی فیلڈ میں بھی لاجواب، بہترین جیالوجی کی سوجھ بوجھ۔ جیوٹیکٹونکس میں اتھارٹی۔ ان کے ساتھ کام کر کے اور جیالوجی سیکھ کر بڑا اچھا لگا۔

ایک دو دنوں سے بلکہ جب سے محمود صاحب آئے، کیمپ میں غیر مرئی مخلوق بلکہ بھوت پریت کی موجودگی زیرِ بحث رہنے لگ گئی۔ میں نے دل میں سوچا کہ علاقہ تو ابھی وہی یعنی سلیمان رینج کا ہے، کہ شاید یہاں بھی کوئی شتونگڑے پائے جاتے ہوں۔ ایک دن کہنے لگے، 'رات کو گھنٹیاں بجتی ہیں اور ایسے لگتا ہے کہ کوئی ہمارے کمرے میں آتا ہے اور چہل قدمی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔'

ایک دن نہایت شدید گرمی تھی اور تونسہ کے رہنے والے خادم حسین ڈرلر اور

ان کے بیٹے نے دعوت دی کہ دریائے سندھ کے ساتھ ہی ان کا گاؤں ہے، وہاں تشریف لائیں۔ فیلڈ ورک سے واپسی پر ان کی طرف گئے اور دریا کے کنارے واقع ان کے گاؤں میں رُکے۔ بہت لطف پایا۔ ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانی سے نہائے اور بعد میں گھوٹا (بادام) پیا۔ ایک چیز نوٹ کی کہ ان کے گاؤں کے ساتھ ہی دریا سے کٹا ہوا پانی کا ایک جوہڑ ہے اور پانی کی سطح پر بننے، مٹنے والے بلبلے بتا رہے تھے کہ وہاں مچھلیاں وافر ہیں اور انتظار میں ہیں کہ کوئی شکاری آئے اور انھیں شکار کرے۔

چنانچہ ایک ہفتہ کے بعد پروگرام بن گیا اور جناب ملک صاحب کی معیت میں سارا کیمپ اس جگہ پہنچ گیا جہاں مچھلیوں کا ذخیرہ نظر آیا تھا۔ صدیق فیلڈ ہیلپر اور ایک ڈرائیور جس کا بھلا سا نام تھا، اس کو شاہ شاہ کہتے تھے، شاید مراتب علی شاہ تھا۔ دونوں ایک جالی لے کر اس جوہڑ میں اترے اور دیکھتے ہی دیکھتے کھگا اور روہو مچھلیوں کے ڈھیر لگنا شروع ہو گئے۔ اشفاق باورچی بھی مع اپنے باورچی خانہ کے وہاں موجود تھا اور وہیں تازہ تازہ مچھلی تلنے لگی اور یار لوگ مزے کرنے لگے۔ تقریباً دو گھنٹے میں کم و بیش ڈیڑھ من کے قریب مچھلی پکڑی گئی۔ کچھ وہیں پہ کھائی گئی اور باقی تھیلوں میں بھر کر کیمپ میں لائی گئی۔ سارا دن بہت اچھا گزرا اور ایک بہترین پکنک کا سماں رہا۔

اپریل کے وسط تک گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ پھر مزید فیلڈ ورک کرنا مشکل ہو گیا تو ہیڈ سروے ڈویژن سے اجازت لے کر اپریل کے آخری ہفتے یا شاید یکم مئی کو کیمپ بند کر دیا گیا اور رپورٹ رائٹنگ کے لیے ذیلی ادارہ لاہور میں واپس

آ گئے۔

ذیلی ادارہ لاہور میں اس وقت بہت جیّد قسم کے جیالوجسٹ تھے جن میں افضال صاحب، عبدالقادر صاحب، عزیزاللہ صاحب، خالد صاحب، سینئر بٹ صاحب، خالق صاحب، اظہر صاحب، ملک صاحب، فاروق صاحب، منہاس صاحب، آصف صاحب، فضل صاحب، اسلم صاحب اور ان گنت چوٹی کے سائنسدان بشمول کیمسٹری ڈویژن فضل صاحب، عمار صاحب، انجم صاحب اسی طرح ڈرلنگ میں راشد صاحب، سرفراز مرحوم، محمود صاحب، عزیر صاحب وغیرہ شامل تھے اور ان تمام کے اوپر جناب یونس صاحب، شاید یہی وجہ تھی کہ ٹرانسفر کے دنوں میں جب فضل صاحب ڈی جی خان آئے تو مجھے کہنے لگے کہ تم ذیلی ادارہ لاہور جا تو رہے ہو لیکن اس آفس میں بڑے بڑے آفاقی سائنسدان اور انجینیئرز ہیں، تمھاری وہاں جگہ بہت مشکل سے بنتی ہے اور بات بھی ٹھیک تھی کہ اتنے سارے لیجنڈ اور ان میں کام کرنا اور پھر منوانا تو دُور کی بات، ان میں بیٹھنا بھی ایک بڑے اعزاز کی بات تھی، لیکن اللہ کا نام لے کر خاموشی سے سر نیچا اور زبان کو کنٹرول کر کے کام کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ عزت اور کامیابی سے نوازتا رہا۔

2000ء کا فیلڈ سیزن چکوال اور اس کے گردونواح کا تھا۔ جناب منہاس صاحب کیمپ انچارج تھے اور ساتھیوں میں عبدالرحمٰن صاحب اور چار پانچ ڈیلی ویج جیالوجیکل اسسٹنٹ تھے۔ جو بعد میں وقفے وقفے سے باہر کے ملکوں میں پرواز کرتے رہے اور ایک آدھ یہیں پر مستقل ہو گئے۔ یہ علاقہ پوٹوہار میں واقع ہے۔ اور

پہاڑیاں سلیمان رینج کے علاقے کی نسبت زیادہ سخت اور بلند ہیں۔ وہی جذبہ اور طاقت یہاں بھی استعمال کی اور ایک بات اور کہ بے شک ناصر صاحب جیسی ہمدرد اور دوست شخصیت ہیڈ کے طور پر کام کر رہی تھی لیکن شیخ صاحب مرحوم کی شاگردی اور قدرتی محنتی رویہ کی وجہ سے اپنی محنت اور لگن میں کوئی فرق نہیں پایا۔

عبدالقادر صاحب اور اظہر صاحب اکثر تکنیکی معاملات میں مجھے نوٹ کرتے اور ساتھ ساتھ سوالات بھی کرتے اور میں اپنی بساط کے مطابق ان کو جواب دیتا تھا۔ بعض اوقات اگر خود ہی سمجھ نہ پاتا تو بے دھڑک بغیر کسی شرم کے حضرات سے راہنمائی لیتا۔ افضال اور عزیز اللہ بہت کھلی طبیعت کے مالک تھے۔ ان سے بالکل ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی بلکہ افضال صاحب تو بہت شفقت اور محبت سے پیش آتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔ یوں لاہور کے اس ذیلی ادارہ میں آہستہ آہستہ اپنے وجود کو ایڈجسٹ کرنا شروع کیا۔

ایک بات تو واضح تھی کہ ذیلی ادارہ کے معاملات چاہے دفتر کے تھے یا فیلڈ کے، ایڈمنسٹریشن یا تکنیکی سوجھ بوجھ ڈی جی خان سے بہت مختلف تھے، یہاں ایک سے بڑھ کر ایک اپنے میدان کا مانا ہوا، تجربہ کار ایکسپرٹ، بڑا منفرد نام، تقریباً سارا پاکستان اور اس میں پھیلی ہوئی جیالوجی کی ہر قسم، خنجراب سے لے کر کراچی تک کی جیالوجی۔ اسی طرح مختلف مزاج کے لوگ، کھلے ڈلے اور کچھ کر گزرنے کی نیت کے لوگ جیسے خالد صاحب جن کے پاس صرف ایک کمپیوٹر تھا اور انھوں نے اس ایک کمپیوٹر کی مدد سے بہت بڑے پراجیکٹ کی بنیاد رکھی یا عبدالقادر صاحب، اظہر

صاحب، ملک صاحب اور اسلام صاحب جیسے لوگ جو فیلڈ جیالوجی کے فلسفہ کو کسی بھی بین الاقوامی جیالوجسٹ سے بہتر سمجھتے تھے۔ باقی سینئر بٹ صاحب اور شیخ صاحب مرحوم کا ذکر ہی کیا، یہ لوگ جب تکنیکی گفتگو کرتے تو دل کرتا بس سنتے ہی جاؤ۔ ان کے علم کے ساگر جب عروج پر ہوتے تو بڑے بڑے سائنسدان سر دُھنتے۔ اسی طرح ایک لمبی فہرست ہے۔ ہر ایک کا احاطہ مشکل ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ ذیلی ادارہ ایک انسٹیٹیوٹ کا درجہ رکھتا تھا اور اس میں رہنے والے ایک سے بڑھ کر ایک تھے بلکہ سارے ہی لیجنڈ تھے۔

اگلا سیزن 2001 دینہ، سوہاوہ، گوجر خان اور ان کے قرب وجوار کا تھا۔ یہاں پر پیدل سروے اور جیوکیمسٹری سروے دونوں یکجا کر دیے گئے تھے۔ یہاں پر بھی جیالوجی کافی مختلف ہے، خاص طور پر سٹرکچر اور فارمیشن میں، اس لیے جیالوجی سیکھنے کے لیے یہ علاقے بہترین ہیں۔ یہاں ملک صاحب کی معیت میں کافی کچھ سیکھنے کو ملا۔ تقریباً آٹھ ماہ میں 9 عدد نقشوں پر مشتمل علاقے کا سروے مکمل کیا۔ اس کے بعد جو تین سیزن 2004 تک کیے، وہ کوہاٹ پلیٹو کے علاقہ میں کیے۔ وہاں پیدل سروے کے علاوہ گاڑی پر نسب آلات کی مدد سے سروے کرنے کا موقع بھی ملا اور سارا ہی علاقہ جس میں کوہاٹ، بنوں، کرک، میراں شاہ، میر علی ٹل، پارہ چنار، شکردرہ، صابرہ آباد غرضیکہ کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں پر پیدل سروے اور کار والا سروے نہ کیا ہو۔ یہاں پر کم و بیش پچاس کے قریب علاقے دریافت کیے جہاں پر یہی گوہر مقصود کی موجودگی کے نشانات تھے، اس لیے اس علاقے میں خوب خوب چھان

چھٹک کے ساتھ کام کیا۔

ملال کیمپ فتح جنگ میں:

2004 کا اختتام تھا جب آفس سے حکم ملا کہ کرک سے فتح جنگ کی طرف کوچ فرما جائیں اور ملال میں کیمپ لگا لیں۔ قمر صاحب ہی ہیڈ سروے ڈویژن تھے اور ہم نے ملال میں جانوروں کے خالی ہسپتال میں اپنا سروے کا کیمپ لگا لیا۔ ہمارے ساتھ ہی جیو فزکس کے جناب ہاشمی صاحب اور فاضل صاحب اپنے اپنے جیو فزکس کے آلات لے کر آ گئے۔ میری ٹیم میں ڈاکٹر احمد بنی صاحب، طیب صاحب تھے۔ اس ٹیم نے خوب محنت کر کے کھوڑ علاقے میں زبردست معدنی نشانات دریافت کیے۔ ابھی سیزن آن ہی تھا کہ قمر صاحب کہنے لگے، 'آپ خود ہی ان آثار کو ایکسپلور کرو۔' چنانچہ ایکسپلوریشن کا ایک کیمپ بھی ہمراہ ہو گیا اور یوں ایک تو کیمپ کی تعداد بڑھ گئی اور دوسرا سائز بھی۔ کچھ ہی ہفتوں بعد جناب انیس صاحب کوئٹہ سے کچھ ماہ کے لیے ہمارے کیمپ میں تشریف لے آئے۔ انیس صاحب لحیم شحیم سے، طبیعت کے لحاظ سے بڑی نفیس قسم کی شخصیت ہیں۔ سانپوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ کافی دن تک ہم لوگ شرارت سے ان کو سانپوں سے ڈراتے رہے اور پھر ایک دن ایک سانپ آ ہی گیا۔ بس پھر کیا تھا انیس صاحب کی پریشان کن چھلانگیں دیکھنے کے قابل تھیں۔ جس چارپائی پر ہم بیٹھے تھے وہ بمشکل ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ اسی طرح ایک دن ایک سپاٹ سروے کے دوران شدید گرمی سے بے ہوش بھی ہو گئے۔

غالباً ستمبر کا مہینہ تھا کہ پروموشن انٹرویو کے لیے اسلام آباد گئے۔ واپسی پر یار لوگوں نے انتہائی یقین کی حد تک باور کروا دیا کہ انیس صاحب کی پروموشن ہو جانی ہے اور ویسے بھی اکتوبر کے مہینہ میں اُن کا ٹوور ختم ہو رہا ہے اس لیے ہمیں یہیں پر پروموشن پارٹی دے دیں۔ یہ 2005ء کی بات ہے۔ اس زمانے میں ان سے ایک ہزار روپے کی مچھلی کھالی گئی لیکن افسوس صد افسوس کہ پروموشن پھر بھی نہ ہوئی، یوں ہم سب لوگ شرمندہ ہو گئے۔

ملال کیمپ میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ہمارے مالک مکان کا ایک بیٹا فوج میں سپاہی کے طور پر خدمات سرانجام دے رہا تھا اور شادی شدہ تھا۔ کچھ عرصہ سے وہ گھر چھٹی پر نہیں آیا۔ پہلے پہل تو کوئی فکر یا پریشانی محسوس نہیں ہوئی لیکن جب اس کی یونٹ کی طرف سے ایک خط آیا کہ تمھیں چھٹی پر گئے ہوئے چار ماہ سے زائد ہو گئے ہیں، لہٰذا واپس یونٹ میں رپورٹ کرو ورنہ تمھارے خلاف کارروائی کی جائے گی، تو گھر میں کھلبلی مچ گئی کہ چار ماہ ہو گئے ہیں لڑکا چھٹی پر روانہ ہوا اور گھر نہیں پہنچا۔ چنانچہ اس کی تلاش کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ یونٹ سے فتح جنگ تک کی تمام ٹرانسپورٹ، بس اڈے، ہسپتال غرضیکہ ہر طرف دوڑ دھوپ کی گئی لیکن اس جوان کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ پھر ایک دن شیخوپورہ کے کسی مردہ خانہ میں کسی لاوارث لاش کے بارے میں علم ہوا تو بوجھل دل کے ساتھ اس ہسپتال میں پہنچے۔ لاش شناخت کے قابل نہ تھی لیکن پھر بھی اس کا DNA کروایا گیا اور رپورٹ کے مطابق یہی اس فوجی کی لاش تھی، جسے ڈھونڈا جا رہا تھا۔ باپ بیچارے کا غم سے برا حال، اور

ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ وہ بھی دیکھی نہ جاتی تھی۔ بہر حال میت کو ہسپتال سے گھر لایا گیا اور نہلا دھلا کر کفنایا گیا۔ اس کے نمازِ جنازہ میں کم و بیش ایک ہزار نفوس نے شرکت کی۔ ہر کسی نے باپ کے ساتھ غم اور افسوس کا اظہار کیا اور یوں اس فوجی کی میت کو سپردِ خاک کیا گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ تک اس فوجی کی بیوہ کا باپ مجھ سے استفسار کرتا رہا کہ اس کا عقدِ ثانی کرنا ہے، اس لیے شریعت کے فیصلہ کے بارے میں آگاہ کریں۔ قصہ مختصر کہ یکم جنوری 2006 کو ہمارا کیمپ وہاں سے شفٹ ہو کر ضلع میانوالی کی ایک تحصیل میں واقع کیمپ میں ضم ہو گیا اور ہم لوگ اپنی نئی ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئے۔

چند ماہ بعد پھر میرا فتح جنگ کے قصبہ ملال سے گزر ہوا تو دل میں خیال آیا کہ چلو اس حوالدار کو ملتے ہیں جس کا بیٹا فوت ہو گیا تھا اور نماز جنازہ پڑھا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے گھر گئے۔ حوالدار کو ملے، وہ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ پھر ایک جوان آیا وہ بھی بڑی گرم جوشی سے ملا۔ چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ چائے پانی کے بعد حوالدار سے اس کے بیٹے کی بیوہ کے بارے میں دریافت کیا کہ اس کی دوبارہ شادی کی کہ نہیں۔ تو حوالدار نے بہت بڑا قہقہہ لگایا اور انکشاف کیا کہ ہم نے تو میت دفنا دی تھی اور رو دھو کے خاموش ہو گئے تھے لیکن ایک دن یہ جواں جو آپ کے پاس بیٹھا ہے، یہ اپنا بیگ لے کر آ گیا۔ یہ ہی وہ میرا بیٹا ہے جس کے شبہ میں ہم نے کسی اور کو دفنا دیا تھا۔ یہ بات سن کر میں یکدم اچھلا اور اس جوان کو غور سے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد جب نارمل ہوا تو ایک سوال ذہن میں گردش کرنے لگا کہ DNA کی رپورٹ کیا ہوئی جس

کی بابت یہ وہی فوجی جوان ہے۔ پھر ایک کے بعد ایک سوال دماغ میں آنے لگا لیکن کوئی بھی سوال نہ پوچھا اور بظاہر خوشی خوشی ان سے مل کر وہاں سے رخصت چاہی۔

تحصیل کیمپ میں:

سروے کیمپ تحصیل ضلع میانوالی ذیلی ادارہ لاہور کے چند تاریخی کیمپوں میں سے ایک ہے۔ اس کیمپ میں بے شمار نامور جیالوجسٹوں نے انچارجی کی ہے۔ ان میں پیش پیش جناب مظہر صاحب جو بعد میں سروے پراجیکٹ ڈی جی خان کے انچارج بنے، جناب عبدالقادر صاحب سابقہ انچارج ذیلی ادارہ کراچی، جناب عزیزاللہ صاحب سابقہ انچارج سروے کیمپ کوہاٹ، جناب افتخار صاحب جیسے لوگ تھے۔ میں آخری کیمپ انچارج تھا۔ اس کیمپ کی ٹیم نے کئی جگہ کھدائی کی اور چھوٹے سائز کے ڈیپازٹ ڈھونڈے لیکن اس ٹیم کا سب سے بڑا کارنامہ صوبہ خیبر پختونخواہ کا ڈیپازٹ ہے۔ خیبر پختونخواہ ڈیپازٹ کے بارے میں آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا پاکستان کا سب سے RICH ڈیپازٹ ہے اور اس کی پیداواری عمر بیسیوں سال سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں ایک بات کا ذکر کرنا مناسب ہو گا کہ ٹیم ورک کی بدولت بڑے سے بڑا مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے اور تقریباً ناممکن کام' آسان لگنے لگتا ہے۔ اس ڈیپازٹ کی تکنیکی وجوہات ایکسپلوریشن کے نقطۂ نظر سے کافی مشکل نظر آتی ہیں۔ یہاں کی فیلڈ جیالوجی بے حد مشکل ہے اور کسی قسم کی معدن کی دستیابی کے لیے قطعاً دوستانہ نہیں اور پھر گوہر مقصود بھی بہت زیادہ گہرائی

میں موجود ہے۔ پھر ڈرلنگ مشینری جو استعمال ہو رہی تھی اس کی کھدائی کرنے کی صلاحیت بھی کم تھی، اس لیے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ یہ بالکل اس وقت کی بات جب یہ بچہ دنیا میں آنا تھا جناب عبدالقادر صاحب کو انکشاف ہوا کہ ڈیپازٹ گہرائی میں ہے اور ہم لوگ اس تک ڈرلنگ کر نہیں پار ہے اور ہماری کھدائی کم گہری ہے۔ لہٰذا ڈرلنگ کی استطاعت بڑھانا پڑے گی۔ اس دوران وہ لاہور آفس میں آ گئے اور ان کی جگہ عزیز اللہ صاحب کیمپ انچارج بن گئے۔ عزیز اللہ صاحب نے کچھ عبدالقادر صاحب کے تجربہ سے اور کچھ اپنی سائنسی معلومات کو بروئے کار لاتے ہوئے، گہری کھدائی کروائی اور یہ بے بی معرضِ وجود میں آیا۔

ستمبر 2006 کی بات ہے جب مجھے ایک بڑے کیمپ کا انچارج بنایا گیا۔ اس کا بیک گراؤنڈ بڑا دلچسپ ہے۔ ہوا یوں کہ ہمارے ایک لیجنڈ آفیسر جو بڑی بڑی ذمہ دار پوسٹ پر کام کرتے رہے ہیں وہ اس پراجیکٹ میں وزٹ پر تشریف لائے، یہ انکا پہلا پہلا وزٹ تھا۔ تقریباً پورے ذیلی ادارہ لاہور کے ہیڈز اور منیجرز، دوسرے ڈیپازٹ کے پروجیکٹ منیجرز اور ذیلی ادارہ لاہور کے اعلیٰ آفیسر ایکسپلوریشن جناب سینئر بٹ صاحب مرحوم اس موقع پر موجود تھے۔ یہ جمعتہ المبارک کا دن تھا جب کھانا کھانے کے بعد جمعہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں، سینئر بٹ صاحب اور راشد صاحب اکھٹے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بٹ صاحب نے کوئی سوال پوچھا تو بحیثیت کیمپ انچارج تحصیل کیمپ میں نے جواب دیا اور ساتھ ہی عرض کیا کہ 'اس بڑے کیمپ میں نفری بہت زیادہ ہے اور تقریباً پانچ ڈویژن کام کر رہے ہیں۔ اور اسی

طرح ہر ڈویژن کے پاس گاڑیاں ہیں اور دوسرے اخراجات کے لیے ایڈوانس بھی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ان تمام ڈویژن والوں کا ایک ہی انچارج ہو جو ان کی کارروائیوں کو مانیٹر اور کنٹرول کرے ورنہ اگر یہ سارے آزادانہ کام کریں گے تو ان کا آپس میں اتفاق کم ہو گا اور ایک کوارڈینیٹر یا انچارج کی موجودگی میں کام کی کوالٹی بھی بہتر ہو گی اور وقت کا ضیاع بھی نہیں ہو گا۔'

راشد صاحب نے میری اس بات کو مذاق میں لیا اور سینئر بٹ صاحب کو ہنس کر کہنے لگے، 'قریشی آپ کی سلطنت کو ہلانا چاہتا ہے لیکن سینئر بٹ صاحب بہت سنجیدگی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اور کچھ سوچ بھی رہے تھے۔ بات آئی گئی ہو گئی اور اسلام آباد والے بڑے صاحب کا وزٹ بھی بہت کامیاب رہا۔ پھر ہم سب لوگ اپنی راہوں میں چل دیے۔

چند ہفتوں کے بعد ایک مالی بے قاعدگی منظرِ عام پر آئی اور چند رپورٹس بھی کہ مختلف ڈویژن کا آپس میں ربط بہترین نہیں ہے۔ اور گاڑیاں بھی بے ترتیبی سے آجا رہی ہیں۔ یہ ساری باتیں وہی تھیں جن کے بارے میں میرے خدشات تھے اور وہ منظرِ عام پر آرہے تھے۔ چنانچہ سینئر بٹ صاحب افسر اعلیٰ ایکسپلوریشن نے جناب عبدالقادر صاحب سے صلاح مشورہ کر کے مجھے کوارڈینیٹر ٹیسٹ پراجیکٹ برائے خیبر پختونخواہ بنا دیا۔ ساتھ ہی کچھ مزید ڈویژن کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح ایکسپلوریشن ڈویژن، مائننگ ڈویژن، پراسیسنگ ڈویژن، ڈرلنگ ڈویژن، کیمسٹری ڈویژن، سول انجینئرنگ ڈویژن اور سیکورٹی ڈویژن کے کیمپ مختلف علاقوں میں

سیٹ کر دیے گئے۔ ان تمام کیمپوں کی ایڈمنسٹریشن فناس اور تکنیکی معاملات کی نگرانی میرے سپرد کر دی گئی۔

انچارج ٹیسٹ کیمپ:

یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ نام تو صرف کو آرڈینیٹر تھا۔ لیکن چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی، چھٹی کا کوئی ذکر نہ تھا۔ سینئر بٹ صاحب نے مجھے دو وائرلیس ٹیلی فون اور ایک عدد جیپ دی ہوئی تھی جن کی مدد سے میں تمام عوامل کو مانیٹر کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جب پہلا ٹیسٹ ویل ڈرل کیا جانا تھا تو ہم سب کھدائی والی جگہ پر مشین پر اکٹھے تھے۔ جن میں راشد صاحب، جناب منشا صاحب، عمر فاروق، میں اور دوسرے ساتھی لوگ تھے۔ کھدائی کے آغاز سے پہلے منشا صاحب نے مجھے دعا کرنے کے لیے کہا۔ پھر میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور یہاں تک تو ٹھیک تھا کہ ایک عمومی دعا کی جاتی لیکن میں جوں جوں دعا کرتا جارہا تھا توں توں میرے ذہن میں نئی سے نئی گزارش، التماس اور منگتیں اترتی گئیں اور میں مانگتا گیا اور ساتھی آمین آمین کہتے رہے۔ شاید قبولیت کی گھڑی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پراجیکٹ کی کامیابی جو بظاہر مشکل نظر آرہی تھی کیونکہ پوری دنیا میں اس وقت تک اتنی زیادہ گہرائی سے گوھر مقصود سطح زمین پر لانے والے صرف دو ترقی یافتہ ملک تھے۔ ایک روس اور دوسرا امریکہ۔ اس لیے ہمارے سینئر انجینئر بشمول مقصود مرحوم اور سرفراز مرحوم یہ خیال رکھتے تھے کہ چونکہ اس سائیٹ میں زیرِ زمین

معاملات اتنے دوستانہ نہیں ہیں اور پانی کی زیرِ زمین حالت کی جیالوجی اس قابل نہیں کہ کوئی بھی مشین چوبیس گھنٹے چلے اور گوھر مقصود سطح زمین پر آئے اور بعد میں پراسیس ہو۔ اس لیے یہ ٹیسٹ بے حد درجہ خدشات اور وسوسوں میں جکڑا ہوا تھا۔

میں نے دل و جان سے دعا کی اور اس کامل یقین کے ساتھ کہ میری دعا قبول ہو رہی ہے۔ میں مانگتا گیا اور مانگتا گیا۔ جب مانگ مانگ کر تھک گیا اور درود شریف پڑھ کر دعا ختم کی تو ایک عجیب روحانی کیفیت طاری تھی اور کچھ ساعت تک کسی نے بھی کوئی بات نہ کی سوائے راشد صاحب کے۔ وہ کہنے لگے، 'قریشی ڈیرہ غازی خاں میں توں بہت شرارتی تھا۔ لیکن یہاں آ کر صحیح معنوں میں مولوی بن گیا ہے۔' بات ہنسی میں ختم ہو گئی۔ ایک دوسرے کا منہ میٹھا کروایا گیا اور یوں ٹیسٹ برائے سائیٹ KPK کا آغاز ہوا۔

ٹیسٹ سائیٹ میں دن رات کام ہو رہا تھا۔ کھدائی کی ذمہ داری راشد صاحب اور ان کی ٹیم پر تھی۔ پراسیسنگ کی ذمہ داری جناب رضا صاحب اور ان کی ٹیم سرانجام دے رہی تھی۔ کھدائی والے سوراخوں کی صفائی اور تیاری کے ذمہ دار خالد صاحب اور ان کی ٹیم تھی۔ اسی طرح سول ورکس والے اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے کہ اسی اثنا میں عمار صاحب تشریف لے آئے اور ان کے ساتھ احمد صاحب۔ دونوں حضرات نے فیلڈ لیب کے بارے میں آگاہ کیا اور نزدیکی بستی میں لیب تیار ہو گئی۔ غرضیکہ اس پراجیکٹ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ذیلی ادارہ

لاہور اور اس کے افسران وماتحت عملہ نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بس ہر دم ایک ہی دُھن تھی کہ اس پراجیکٹ کو ہر حال میں کامیاب کرنا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ تقریباً تمام تجربہ کار اور لیجنڈ انجینئر کا خیال تھا کہ ایک ہزار فٹ کی گہرائی سے گوھر مقصود سطح زمین پر لانا بہت مشکل کام ہے۔ اوّل تو اتنی پائیدار مشینری کوئی نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو اتنی گہرائی کی وجہ سے اس کا مستقل انداز میں کام کرنا مشکل ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے باوجود کچھ انجینئر مثلاً چوہدری صاحب، ریحان صاحب، عامر صاحب نہ صرف اس پراجیکٹ کی کامیابی کے لیے سر توڑ کوششوں میں مصروف تھے بلکہ یہ یقینِ کامل بھی رکھتے تھے کہ پراجیکٹ ضرور کامیاب ہو گا۔

انھی دنوں میں کچھ پریشان کن، کچھ مزاحیہ اور ملے جلے واقعات بھی رونما ہوئے۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ مقامی لوگ کثیر تعداد میں روزانہ ہی میری رہائش گاہ یا سائیٹ پر اکھٹے ہو جاتے اور مطالبہ کرتے کہ ہمیں بھی ملازمت دی جائے۔ ورنہ ہم آپ کو بھی کام نہیں کرنے دیں گے۔ یاد رہے کہ اس وقت تک نہ تو کوئی پولیس گارڈ میسر تھی اور نہ ہی سیکورٹی۔ سب کچھ اللہ کی امان میں ہوتا تھا۔ صبح صبح نہ جانے کتنے موڑوں پر گھات لگائے کوئی بھی فائر لگا کر زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ لیکن چونکہ ہر چیز اللہ پر چھوڑی ہوئی تھی اس لیے یہ یقینِ کامل تھا کہ جس دن موت آنی ہے، آئے گی، کوئی نہیں روک سکے گا اور اگر موت نہیں لکھی تو پھر پریشانی کس بات کی۔ روزانہ صبح آٹھ بجے سے لے کر رات دس بجے تک میں سارے کیمپوں کے لیے ہر ممکن آسائش ڈھونڈتا۔ کسی کے پاس پانی نہیں، کسی کے پاس گیس سلنڈر

نہیں، کسی کا لکڑی کو ئلہ ختم ہو گیا ہے اور بعد ازاں سائیٹ والوں کے پر ابلم۔ ان کے لیے تکنیکی ہر چیز اور ڈیزل، پٹرول کا بندوبست غرضیکہ ہر وقت حالتِ جنگ میں رہنا، لیکن مقامی لوگوں کے ساتھ گفت وشنید میں بھی رہنا۔ یہاں تک کہ نمازیں بھی اکھٹی پڑھتے۔ بیروزگاری کی وجہ سے مقامی لوگوں کا زیادہ تر ایک ہی مطالبہ ہوتا کہ مزید آسامیاں پیدا کی جائیں اور ہمارے مزید ملازم رکھے جائیں۔

لیکن محدود پیمانے کے کام کے لیے محدود آسامیاں ہوتیں جو ساری کی ساری پُر رہتیں اور مزید کے لیے ذیلی ادارہ لاہور کی مینجمنٹ کے ساتھ بھی گفت وشنید ہوتی رہتی۔

پھر کبھی کبھی یہ ہوتا تھا کہ مقامی لوگوں میں سے کچھ شرارتی لوگ مختلف حیلے بہانے سے یا بلیک میلنگ سے کام لیتے یہاں تک کہ کچھ لوگ تو جان لینے کی بھی باتیں کر جاتے لیکن بعد میں معذرت بھی کرتے۔

اسی طرح ایک شخص جو ہر بار نوکری کے لیے آتا تھا اور میں اس کو ٹالتا رہتا تھا۔ میرے پاس آیا اور ایک مرا ہوا کتا گودی میں اٹھا رکھا تھا۔ مجھ سے بولا، یہ کتا تمھارے ڈرائیور طارق نے گاڑی کے نیچے دے کر مار دیا ہے۔ یہ مجھے بہت عزیز تھا۔ میں نے بہت مہنگا خریدا تھا اور دیکھو اس پر میں نے مہندی بھی لگائی ہے۔' یہ ساری باتیں وہ انتہائی جذباتی کیفیت میں اور ایسے بنا بنا کر بیان کر رہا تھا کہ اچھا خاصا جمگھٹا اکھٹا ہو گیا اور لوگ اس کے حق میں بولنے لگے۔ پھر لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے کہنے لگا۔ 'یہ کتا صرف کتا نہیں تھا میرا سب کچھ تھا۔ میرا بیٹا تھا بلکہ جذبات کی رو

میں مزید بہہ گیا اور اس کے منہ سے یہ نکلا کہ 'یہ میرا باپ تھا۔ حالانکہ کہنا وہ کچھ اور چاہتا تھا۔'

میں چونکہ اس کی ان تمام جذباتی باتوں کی بیک گراؤنڈ سے واقف تھا اور مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی میں اس کو کہوں گا کہ 'اچھا تم کل آجانا، تمھاری نوکری پکی!' تو اس کی یہ تمام ڈرامہ بازی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔

میں نے اسے کہا، 'جاؤ، پہلے اس کو دفناؤ اور کل میرے پاس آنا۔ میں تمھاری نوکری کے بارے میں کچھ سوچوں گا۔' تو اس نے یکلخت کتے کی لاش کو زمین پر پٹخا۔ جذباتی کیفیت سے نکلا اور اپنا لباس جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا اور اس نے جو مجمع اکٹھا کیا تھا وہ بھی تِتّر بِتّر ہو گیا۔

بعد میں سب سے پہلے تو میں نے ڈرائیور کو ذیلی ادارہ لاہور میں بھیج دیا اور اس کتے والے آدمی کے ساتھ ایک مہینہ بعد آنے کا وعدہ کر کے اس معاملے کو ٹھنڈا کیا۔

اس طرح ایک اور شخص تھا، نام غالباً قمر تھا اور وہ علاقے کا غنڈا ٹائپ آدمی تھا۔ مقامی لوگوں میں ایسا رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے دو تین باڈی گارڈ ساتھ رکھتا تھا۔ اس کے پاس آتشیں اسلحہ بھی ہوتا تھا۔ اس کو کہیں غلط فہمی ہو گئی کہ پراجیکٹ والے لوگ بہت ڈرپوک ہیں، میں ان کو ڈرا دھمکا کر کچھ اپنے لوگ بھرتی کروالوں گا اور دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی نکلوالوں گا۔ یہ تقریباً روز ہی آجائے اور عین سائیٹ پر آکر جگا گیری کرنے کی کوشش کرے۔ میں نے تمام افسران اور عملہ کو ہدایت کی تھی کہ جب یہ شخص آئے تو آپ نے کام نہیں چھوڑنا اور نہ ہی

میرے پاس آنا ہے، میں جانوں اور یہ شخص جانے۔ اور اسی طرح ہوتا تھا۔ میں اللہ کے بھروسے کھڑا ہو جاتا، اس کے ساتھ گفتگو کرتا اور یہ تقریباً لاجواب ہو کر چلا جاتا۔ اگلے دن پھر آجاتا اور تقاضا کرتا کہ یہ ہمارا علاقہ ہے اس لیے ہمارے کچھ بندے ملازم رکھو۔ میں کہتا ابھی گنجائش نہیں، جب ہو گی تو تمھارے ہی رکھنے ہیں اور کس کے رکھنے ہیں۔ پھر ایک دن میں ذیلی ادارہ لاہور کسی کام کے سلسلہ میں گیا تو یہ دوبارہ سائیٹ پر آگیا اور مائننگ سائیٹ پر اپنا ٹریکٹر لا کر ایک جگہ زمین ہموار کرنے لگا۔ پتہ یہ چلا کہ موصوف یہاں چائے کا کھوکھا کھولنا چاہتے ہیں تا کہ مقامی افراد جو یہاں کام کرتے ہیں وہ اس کے کھوکھے سے چائے وغیرہ پی کر اس کو بکری کروائیں۔ جناب حنیف صاحب موجود تھے، انھوں نے پہلے تو بہت نرمی سے اسے سمجھایا لیکن یہ حنیف صاحب کی نرمی کو انکی کمزوری سمجھتے ہوئے نڈر ہو گیا کہ یہ ہمارے لوگوں کی جگہ ہے یہاں چائے خانہ ضرور بنے گا۔ مجبوراً حنیف صاحب کو پولیس کو بلانا پڑا اور قمر کو انھوں نے حراست میں لے لیا۔ کچھ دیر مقدمہ چلتا رہا اور پھر قمر کو اس جگہ سے قانونی طور پر علاقہ بدر ہونا پڑا۔

اسی طرح سائیٹ پر کبھی کبھار کوئی مفرور بمعہ اسلحہ کے آجاتا اور اپنے جسم کے ساتھ بندھے ہوئے اسلحہ، گولہ بارود کی دھمکی دیتا، غرضیکہ ہر طرف سے کافی مشکلات درپیش تھیں لیکن سارا وقت اللہ کے سہارے دن رات کام ہو رہا تھا۔

اسی دوران دو یا تین ماہ کے لیے میں واپس ذیلی ادارہ لاہور آگیا اور خالد صاحب کو پہلے انچارج اور بعد میں پراجیکٹ مینجر سائیٹ بنا دیا گیا۔ تھوڑے دنوں کے

بعد خالد صاحب کو ایک دوسرے پراجیکٹ پر انچارج بنا دیا گیا اور میں پھر واپس اسی سائیٹ پر بطور کوانچارج اعلیٰ کام کرنے کیلئے آ گیا۔

اب کی بار چونکہ عبدالقادر صاحب کی ٹرانسفر ذیلی ادارہ کراچی میں بحیثیت اعلیٰ انچارج کے ہو گئی تھی اس لیے چوہدری صاحب انچارج ٹیسٹ سائیٹ بن گئے اور ذیلی ادارہ لاہور میں بیٹھ کر سائیٹ اور دفتر دونوں جگہ پروگرام کی دیکھ بھال کرنے لگے۔

چوہدری صاحب نے بڑا زبردست کام کیا، چونکہ وہ ایک انتہائی تجربہ کار انجینئر تھے جنھوں نے کراچی اور خاص طور پر پرانے ٹیسٹ پراجیکٹ پر کام کیا ہوا تھا اور اس خصوصی نوعیت کی مائننگ کی تمام تکنیکی باریکیوں سے آگاہ تھے، اس لیے ان کا تجربہ اس ٹیسٹ سائیٹ میں بہت کام آیا۔ انتہائی لائق ہونے کے علاوہ وہ محنتی بہت تھے۔ ٹیسٹ مائننگ کے جتنے اسرار و رموز ہیں، ان کو اچھی طرح جانتے تھے اور میں نے بھی چوہدری صاحب جیسا ماہر کوئی نہیں دیکھا۔ ان کے بعد آنے والوں میں ریحان صاحب اور عامر صاحب ان کے صحیح معنوں میں جانشین ثابت ہوئے۔ چوہدری صاحب اور ان کی ٹیم کی شب و روز محنت کا جادوئی کمال تھا کہ پہلا سیٹ وقت مقررہ سے بھی پہلے تیار ہو گیا اور ہم تقریباً کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہوئے فائنل مقام پر پہنچ گئے۔

ایک دن ایک ہول کی تعمیر ہو رہی تھی کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے اندھیرا ہو گیا اور پھر بادل بھی آ گئے۔ سخت سردی کا موسم تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے چوہدری صاحب کو کہا کہ سر آپ چلیں کیمپ میں، لڑکے کام کر لیں گے، تو بولے 'نہیں، یہ کام ذرا ٹیڑھا ہے، آپ میری فکر نہ کریں۔ انشاءاللہ کام ختم ہو گا تو میں ان کے ساتھ ہی کیمپ جاؤں گا۔ پھر میں نے کہا کہ میں کیمپ جا کر آپ کے لیے رضائی بھیجتا ہوں کیونکہ سردی بڑھ رہی ہے، لیکن چوہدری صاحب نے مسکرا کر انکار کر دیا اور یوں صبح اذانوں کے وقت تک کام مکمل کر کے ہم سب لوگ ایک ساتھ کیمپ پہنچے۔

ٹیسٹ پراجیکٹ میں کام کی مشکل نوعیت کو سمجھتے ہوئے مین آفس نے ہمیں کچھ ایڈوانس رقم سپورٹس کے لیے دی جس سے کیمپ میں ٹیبل ٹینس، بیڈ منٹن اور کرکٹ جیسی کھیلوں کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس سے جہاں کام کی سختی کی وجہ سے جو ٹینشن بنتی تھی، وہ زائل ہو جاتی اور افسران دوبارہ تازہ دم ہو کر میدانِ عمل میں کود پڑتے۔

ایک دن ایک مقامی صاحب چادر میں لپٹے ہوئے سائیٹ میں میرے پاس آئے اور آتے ہی بولے، 'آج کل دھماکے بہت ہو رہے ہیں، اگر تمھارے اس پلانٹ میں بھی کوئی خود کش بمبار آ جائے اور بم پھوڑ دے تو؟' میں نے فوراً جواب دیا، 'اللہ نہ کرے ایسی کوئی کوشش ہو کیونکہ اس طرح پورے علاقے کو زبردست آگ لگ جائے گی اور اس پر قابو پانا تقریباً تقریباً ناممکن ہو گا۔' 'ہوں!' یہ کہہ کر وہ صاحب وہاں سے چل دیئے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک خطرناک تنظیم سے متعلق تھے اور ٹارگٹ کی تلاش میں تھے۔ اللہ نے بچایا ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس میں

کوئی شک نہیں کہ اس سارے پروگرام کی حفاظت اللہ کی ذات ہی کر رہی تھی ورنہ ٹارگٹ اس کے سامنے تھا اور کسی قسم کی کوئی سکیورٹی ابھی وہاں تعینات نہیں ہوئی تھی۔ بس ویسے ہی اس کے ذہن میں اللہ نے اس معاملے میں احتیاط ڈال دی اور ہم ایک بڑی مصیبت سے بچ گئے۔

دن گزرتے رہے اور دن رات کی محنت رنگ لائی اور تقریباً سارا ہی بنیادی ڈھانچہ تیار ہو گیا اور پاکستان کے اس فقید المثال محکمہ کے لیے ایک اور تاریخ ساز دن آنے کے لیے مچلنے لگا۔ جب تمام سوراخ تیار ہو گئے اور ان میں خاص خاص محلول ڈال دیئے گے تو شب و روز محنت کا پھل کھانے کے لیے انتظار ہونا شروع ہو گیا۔ اور انتظار تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اسی دوران جناب سینئر بٹ صاحب مرحوم پراجیکٹ سائیٹ پر تشریف لائے اور معمولی سی پریشانی کا اظہار کیا کہ ابھی تک کامیابی کی خبر نہیں مل رہی۔ خدانخواستہ کہیں ناکامی تو نہیں ہو گئی۔ مجھ سے پوچھا کہ کیا خیال ہے؟ میں نے کہا، سر پہلے پہل کچھ دیر ہو جاتی ہے، انشاءاللہ یہ گوہر مقصود یہاں پر پیدا ہی اس لیے ہوا ہے کہ اس کو یہاں سے نکلنا ہے۔ اللہ نے یہاں کے لوگوں کو روزگار دینا ہے اور مستقبل کی آنے والی نسلوں کو اس سے سیراب کرنا ہے۔ اور ساتھ ہی میں نے ایک دوسرے کامیاب پراجیکٹ کی مثال بھی دی کہ وہاں پر بھی ایک ماہ سے زائد کا عرصہ ہو گیا تھا، پھر خوشخبری ملی تھی۔ جناب سینئر بٹ صاحب بے حد مطمئن ہو گئے اور ان کے چہرے پر طمانیت کے آثار آ گئے۔

اس بات کے کچھ ہی دنوں بعد اللہ تعالیٰ نے کامیابی سے ہمکنار کیا اور پھر یوں

ہی ہوا کہ وطن عزیز اُن گِنے چُنے ملکوں میں شمار ہونے لگا جنھوں نے اس فقید المثال کامیابی کو مقررہ وقت پر حاصل کیا۔

اس ٹیسٹ کی کامیابی نے ترقی کے کئی دروازے کھول دیئے۔ماہرین دھڑا دھڑ سائیٹ کا رخ کر رہے تھے اور سائیٹ کی شکل وصورت میں ایک خاص قسم کی تبدیلی اور نفاست نظر آنے لگی تھی۔ سکیورٹی کے ادارے بھی اپنا کیمپ لے کر آ گئے اور یوں میری ڈیوٹی آہستہ آہستہ اپنے تکمیل کے مراحل طے کرنے لگی۔ جولائی 2006 میں اللہ تعالیٰ نے ایمان فاطمہ سے نوازا اور اگلے سال مئی 2007 کو مجھے ایوارڈ دینے کا اعلان ہوا جو کہ میں نے مئی 2008 کو ایک بھرپور و بارونق تقریب میں وصول کیا۔ یہ میڈل مجھے اب تک کی محنت و کاوش اور کام سے لگن کے عوض دیا گیا، خاص طور پر اس ٹیسٹ پراجیکٹ کے لیے جو سر توڑ کوششیں کیں اللہ تعالیٰ نے اور افسر اعلیٰ ایکسپلوریشن نے اس کا ایوارڈ دیا۔ میڈل گلے میں ڈال کر جب میں جناب سینئر بٹ صاحب کے آفس میں ان کا شکریہ ادا کرنے گیا تو بولے، 'شکریہ کس بات کا؟' ابھی تو مزید اور رُکے ہوئے کام ہیں جو آپ نے کرنے ہیں۔ اس لیے ابھی اپنے آپ کو ریلیکس نہ کریں اور نہ ہی فیلڈ شوز اُتاریں۔' ان رُکے ہوئے کاموں میں ایک تو بلوچستان کے علاقہ میں پیدل سروے تھا اور دوسرا گلگت بلتستان ایریا میں دریاؤں کی ریت سے مفید اور کارآمد معدنیات کا حصول۔ اوّل الذکر کام تو شروع ہونے سے پہلے ہی اپنی نوعیت بدل گیا جب کہ آخر الذکر کام کا آغاز جنوری 2008 سے شروع ہو چکا تھا۔

گذشتہ دو سالوں میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے ایسے ایسے انعامات سے نوازا کہ میں خود حیران تھا اور ایک عجیب کیفیت کا شکار تھا کہ اتنے سینئر افسران کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نہ صرف دفتری ذمہ داریوں سے نواز رکھا تھا بلکہ ان میں کامیابیاں بھی عطا کر رہا تھا۔ اس دوران میں اپنے گھر میں شفٹ ہوا اور مزید مالی آسودگی بھی حاصل ہوئی۔ 2008 میں ہی میری تیز ترین پروموشن کی سفارش ہوئی اور میں انٹرویو کے لیے اسلام آباد گیا۔ گو پروموشن تو نہ ہوئی لیکن مزا بڑا آیا۔

اس ساری صورتِ احوال سے نزدیکی افسران بھی بخوبی آگاہ تھے بلکہ ایک دن ملک صاحب کہنے لگے، 'عباس یار یہ جب سے تیری بیٹی ایمان فاطمہ پیدا ہوئی ہے تیرے بہت سے اعلیٰ کام ہوئے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے لیے اس کو میرے پاس رہنے دو، میرے بھی کافی کام رُکے ہوئے ہیں۔ ماشااللہ سے یہ بیٹی بڑی قسمت والی ہے۔'

بیٹیاں واقعی قسمت والی ہوتی ہیں اور اپنے ماں باپ کے لیے طمانیت کا باعث بھی۔ اللہ تعالیٰ سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے اور وہ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں، آمین ثم آمین!

اپریل تا مئی 2009ء کے دوران غیر ملک میں ایک ماہ کی تربیت حاصل کی اور ساتھ میں دانش صاحب، جونئیر بٹ صاحب، ہاشمی صاحب، فاضل صاحب اور موجودہ انچارج ذیلی ادارہ کراچی شامل تھے۔

گلگت بلتستان میں:

ملک صاحب(CE) ایک بہترین سائنسدان رہے ہیں۔ ان کو جیو کیمسٹری کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور وہ تھے بھی اپنے وقت کے بہترین تجزیہ کرنے والے۔ ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ 80 کی دہائی میں گلگت اور سکردو جیسے علاقوں میں کام کر چکے تھے اور ان کی رپورٹس بھی وہاں پر موجود چند انتہائی مفید معدنیات کے بارے میں نشان دہی کر چکی تھیں۔ اس لیے پہلے پہل شمالی علاقہ جات کے دریاؤں کی ریت کو کھنگالنے کی ذمہ داری جناب ملک صاحب کے سپرد ہوئی اور اسی دوران میں فروری 2008 میں ٹیسٹ پراجیکٹ سے فارغ ہو گیا تو ملک صاحب نے مجھے اپنے ساتھ ملا کر شمالی علاقہ جات کے تقریباً تمام بڑے بڑے دریاؤں سے ریت کے نمونے اکٹھے کرنے کا اور بعد ازاں ان کا کیمیائی تجزیہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ہم نے تقریباً 450 کلو میٹر لمبائی پر پھیلے ہوئے ان مخصوص نوعیت کے علاقوں سے نمونے اکھٹے کرنا شروع کیے۔ شمالی علاقہ جات جنکو کو اب گلگت بلتستان کہا جاتا ہے، اس میں بہنے والے تمام بڑے بڑے دریا مثلاً دریائے سندھ، دریائے شیوک، دریائے شِغر، دریائے ہنزہ اور دریائے گلگت، ان تمام دریاؤں سے سیلاب کے دنوں میں اُگلی ہوئی ریت ہمارا ٹارگٹ تھی۔ یہ جہاں جہاں ایک مخصوص نوعیت کی شکل میں موجود ہوتی، ہم اس کا نمونہ حاصل کرتے اور بعد ازاں کیمیائی تجزیہ کر کے اپنے لیے مفید نتائج حاصل کرتے۔ 2008 میں گلگت بلتستان کے علاقہ میں ہم نے خوب خاک چھانی۔ گرمیوں میں تو بہت اچھا لگتا تھا لیکن سردیوں میں منفی 8 درجہ حرارت پہ کام کرنا ایک معنی

رکھتا تھا۔ غالباً مارچ 2008 میں جب ملک صاحب افسر اعلیٰ پلاننگ اینڈ کو آرڈی نیشن بن گئے تو یہ ریت چھاننے والی ساری ذمہ داری میرے کاندھوں پہ آگئی۔ جناب سینئر بٹ صاحب، رضا صاحب، خالق صاحب وغیرہ بہت توجہ سے اس پراجیکٹ پر کام کرنا چاہتے تھے۔ اسی دوران اگست 2008 میں چلاس کے زیریں علاقہ متصل دریائے سندھ پر ہم نے ایک ماہ دریائے سندھ کی ریت کو اکھٹا کرنا اور پراسیس کرنا شروع کیا جو ایک ناکام تجربہ ثابت ہوا کیونکہ جس نوعیت کا پراسیس درکار تھا، وہ ہم نہیں کر رہے تھے۔ ایک دن ایک مقامی آدمی سے ملاقات ہوئی اور اس نے آگاہی دی کہ جو پراسیس آپ کرنا چاہ رہے ہیں، اس کے لیے کوئی دوسری قسم کی مشینری درکار ہے جو کہ گلگت کے قریب ایک پرائیویٹ فرم استعمال کر رہی ہے۔ اور اس کے خاطر خواہ نتائج بھی آرہے ہیں۔ چنانچہ میں اور صداقت اس طرف گئے اور جو مشینری خاطر خواہ نتائج دے رہی تھی، اس کی رپورٹ ذیلی ادارہ لاہور میں افسر اعلیٰ کو دی۔ بعد ازاں اس جیسی مشینری کا بندوبست کر کے گلگت کے قریب دریائے ہنزہ پر ایک جگہ منتخب کی اور وہاں پلانٹ نصب کیا گیا۔

اسی دوران عطا آباد جھیل والا واقعہ ہو گیا اور یہ ڈر مسلسل رہا کہ اگر جھیل پھٹ جاتی ہے تو دریائے ہنزہ میں سیلاب آجائے اور ہمارا پلانٹ اس میں بہہ جائے تو پھر؟ لیکن اللہ کا بہت فضل رہا اور یہ حادثہ وقوع پذیر نہ ہوا۔

ہمارے پاس ایک مقررہ ٹائم ٹیبل تھا جس کے مطابق ہم نے سردیوں میں دریا سے منتخب شدہ ریت نکالنا تھی اور گرمیوں میں پراسیس کرنا تھی۔ اس لیے دن رات

انتہائی ٹھٹھرتے موسم میں تقریباً منفی 8 درجہ حرارت پر کام شروع کیا گیا۔ سردی اتنی تھی کہ اگر کھڑے ہیں تو بیٹھا نہیں جاتا تھا اور اگر بیٹھے ہیں تو کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔

جُٹیال میں ایک خالی گھر میں اپنا کیمپ لگا ہوا تھا۔ صبح صبح اکرم مرحوم پانی کے ڈرموں کے نیچے آگ لگاتا اور نیم برفیلے پانی کو اس قابل بناتا کہ ورکرز اور آفیسرز کم از کم منہ ہاتھ دھو لیتے۔ دن کے اوقات بھی بہت کم تھے لیکن جان توڑ محنت کر کے 12 گھنٹے کام کر ہی لیتے تھے۔ سائیٹ پر دریا کے کنارے بھی بہت سردی پڑتی تھی۔ یہاں حنیف صاحب جو آج کل کے۔پی۔کے۔ کے ایک پراجیکٹ منیجر ہیں اور انجینئر ریحان صاحب کے ساتھ عامر انجینئر، ان لوگوں کا ذکر بہت ضروری ہے۔ ان لوگوں نے اپنی اپنی ذمہ داری انتہائی احسن طریقے سے سرانجام دی اور ایک مشکل کام کو آسانی میں بدل دیا۔

پراسسنگ ڈویژن کے تکنیک کاروں اور مائننگ ڈویژن کے تکنیک کاروں کی محنت، اپنے کام سے لگن اور ایمانداری ضرب المثل کی طرح لگیں۔یہی وجہ تھی کہ تمام کام ٹائم لائن کے متوازن چل رہا تھا۔

یہاں اگر گلگت بلتستان کے لوگوں کا ذکر نہ کیا جائے تو بات انصاف پر مبنی نہیں لگتی۔ انتہائی محب وطن، شریف النفس، مہمان نواز اور محنتی لوگ ہیں۔ پاکستان کے ساتھ والہانہ محبت کرتے ہیں۔ ملک پرستی جتنی ان لوگوں میں دیکھی شاید ہی پورے پاکستان کے کسی اور شہر یا قصبہ میں نظر آئی۔ یہاں جس اطمینان اور سکون کے ساتھ

پراجیکٹ مکمل کیا کسی اور علاقے میں تقریباً ناممکن تھا۔ ڈی جی خان، کرک، بنوں کئی علاقوں میں پراجیکٹ کیے لیکن جتنے پُرامن ماحول میں یہاں کام کیا، یہ بھی یہاں کی ایک خاص روایت بنی۔

یہاں اس پراجیکٹ سے پہلے کچھ بنیادی تربیت بھی حاصل کرنا پڑی۔ کیوں کہ جس پراسیس کے ذریعے ہم لوگ اپنی معدنیات کو افزودہ کرنا چا رہے تھے، وہی طریقہ یہاں سونے کی تلاش کرنے والے اپنے پرانے روایتی اوزاروں سے کر رہے ہیں۔ لیکن ان کا مطمعِ نظر صرف اور صرف سونا(گولڈ) ہوتا ہے۔ اوپر بلند بالا پہاڑوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور کارگزاری کے طفیل سونے کے علاوہ بھی قیمتی دھاتیں اور معدنیات ایک خاص شکل کی وریدوں اور شریانوں میں پیدا کی ہوتی ہیں۔ جب یہی وریدیں اور شریانیں ہوا، پانی اور دوسری قدرتی ٹوٹ پھوٹ کے عوامل کا شکار ہوتی ہیں تو ان میں پائی جانے والی معدنیات و دھاتیں پسپا ہو کر پہلے پہل اپنے مرکز سے جدا ہوتی ہیں اور پھر تیز پانی کے بہاؤ کے ساتھ دوسرے تیز نوکیلے پتھروں کی رگڑ کی وجہ سے اپنا حجم کئی گناہ کم کر کے تقریباً ریت کے سائز کے برابر ہو جاتی ہیں اور دوسری ریت میں گم ہو کر اسی ریت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ دھاتیں اور معدنیات چونکہ اپنا ایک خاص وزن رکھتی ہیں، اس لیے مقامی لوگ اپنے اوزاروں اور خود ساختہ مشینوں کو استعمال کر کے ایک خاص اور طویل الوقت طریقہ سے دوسری ناقابلِ استعمال ریت سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ یوں سمجھیں اپنی مطلوبہ دھات جو کہ سونا ہوتی ہے، اس کو افزودہ کر لیتے ہیں اور راولپنڈی جا کر کچا سونا کر کے

بیچتے ہیں۔ یہ خالص چوبیس کیراٹ سونا ہوتا ہے لیکن چونکہ دوسری معدنیات کے ملنے کی وجہ سے ناخالصیت بڑھ جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی مارکیٹ قیمت میں تھوڑی کمی ہو جاتی ہے۔ لیکن سونا بہر حال سونا ہوتا ہے اور قیمتی دھات ہے۔

یہاں ان کے طریقۂ کار کا ذکر کرنا بے حد معلوماتی ہو گا۔ ماروز لوگ یعنی سونا نکالنے والوں کا عام طور پر پورے کا پورا خاندان اس کام میں ملوّث ہوتا ہے۔ تقریباً صبح کے نو یا دس بجے پورا خاندان جس میں بچے، خواتین، بوڑھے اور جوان سبھی لوگ شامل ہوتے ہیں، دریا کے کنارے اپنی خود ساختہ مشینوں کے ہمراہ آجاتے ہیں۔ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ عمر رسیدہ اشخاص اس کام سے لاتعلق ہیں اور عورتیں صرف ایندھن کی تلاش کر رہی ہیں اور بچے کھیل کود میں مصروف ہیں، صرف جوان آدمی اپنے اوزاروں کو دریا کے ٹھنڈے ٹھار پانی میں استعمال کر رہے ہیں، لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ بچے اور عورتیں دریا کے کناروں اور تہہ میں ٹنگے ہوئے ریت اور پتھروں کو خوب پہچانتے ہیں، اس لیے پھر مخصوص رگ پر جا کر ریت، مٹی اور پتھر اپنے کپڑوں کی جھولیوں میں بھر بھر کر دیسی ساختہ لکڑی کی چھوٹی سی کشتی میں انڈیلتے رہتے ہیں یا اس کے نزدیک بھی ڈھیر بنا دیتے ہیں۔ جبکہ جوان افراد کشتی نما چیز میں اس میٹریل کو انڈیلتے اور مسلسل اس کے اوپر پانی ڈالتے رہتا ہے تاکہ پتھر اور غیر ضروری مٹیریل باہر نکل جائے اور قیمتی دھاتوں کا عرق اس کشتی میں جمع ہوتا رہے۔ جب پورے دن کے استعمال کا سامان اکھٹا ہو جاتا ہے تو بچے کھیل کود میں مصروف ہو جاتے ہیں اور عورتیں کھانا پکانے کے لیے ایندھن کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتی

ہیں۔ اسی اثنا میں گھر کے ایک بزرگ بابا جی چارپائی پر بیٹھے حقے کے کش لگانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ اسی دوران تقریباً دن کے دو بجے تک وہ جوان سارے میٹریل کو اچھی طرح چھان لیتے ہیں اور وہ منوں کے حساب والا میٹریل صرف دو چار کلو گرام رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ دو چار کلو گرام ہی اصل مغز ہوتا ہے۔ اس مغز کا رنگ کالا ہوتا ہے اور مقامی لوگ اسے 'کالی ریت' ہی کہتے ہیں۔ اس کا یہ کالا رنگ، مختلف معدنیات جس میں لوہے کی معدن زیادہ ہوتی ہے، ان کی وجہ سے ہوتا ہے اور دوسری معدنیات میں چھپے ہوئے سونے کے ذرّات بھی الٹتے پلٹتے نظر آتے ہیں۔ جب یہ سٹیج آجاتی ہے تو اب وہ بظاہر لاتعلق بزرگ جو دراصل سب کچھ جانچ رہے ہوتے ہیں، اپنی اپنی چارپائی سے اٹھتے ہیں اور جہاں پر یہ تمام عمل ہو رہا ہوتا ہے، وہاں پر آجاتے ہیں۔ کشتی والے جوان اب بھدی میں موجود کالی ریت اور اس میں موجود سونے کے ذرّات کو مزید نتھارتے ہیں۔ جب اس میں مزید نتھارنے کی گنجائش نہیں رہتی تو یہ لکڑی کی پلیٹ بزرگ اشخاص کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ وہ بزرگ اپنے کرتے کی جیب سے ایک شیشی نکالتے ہیں جس میں پارہ (مرکری) موجود ہوتا ہے۔ اس پارہ کو کالی ریت پر تھوڑا تھوڑا انڈیلتے ہیں اور ساتھ ساتھ مسلتے رہتے ہیں۔ پارے میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ صرف سونے کے ذرّات کو ہی جذب کرتا ہے اور کسی دوسری دھات یا معدن کو نہیں۔

کالی ریت اور پارے کے آپسی ملاپ کا عمل کوئی 15 سے 20 منٹ تک رہتا ہے۔ جب اپنے تئیں پارے کو اچھی طرح کالی ریت میں مسل دیا جاتا ہے تو پھر ایک

دوسرے دھاتی پیالے میں انڈیل جاتا ہے اور اس کے نیچے موم بتیاں یا دیے کی روشنی اور حرارت پہنچائی جاتی ہے۔ اس حرارت والے عمل سے پارہ ہوا میں اڑ جاتا ہے اور نیچے چھوٹی سی ایک گولی رہ جاتی ہے۔ یہ گولی سونے کی ہوتی ہے جسے کچا سونا کہا جاتا ہے اور یہ خالص سونا ہوتا ہے۔ بعد ازاں وہی بزرگ اپنی جیب سے ایک تھیلی نکالتے ہیں جس میں اور بھی سونے کی گولیاں ہوتی ہیں۔ ان گولیوں میں اس گولی کا بھی اضافہ کرتے ہیں اور تھیلی بند کر کے واپس جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ یہ اس بات کا اشارہ بھی ہوتا ہے کہ آج کا کام بند ہوا اور واپس اپنے اپنے خیموں میں لوٹنے کا وقت ہو گیا۔ اس دوران تقریباً شام کے 4 بج رہے ہوتے ہیں۔ یوں یہ سارا عمل کوئی چھ یا سات گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ یہی عمل، جس میں منوں ٹنوں ریت میں سے اپنی ضروری معدن نکالنی تھی، وہ ہم لوگوں نے کیا، لیکن بڑی بڑی مشینوں اور اوزاروں کی مدد سے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی کامیابی سے نوازا، جس نے مستقبل میں مزید کامیابیوں کے دروازے کھول دیے۔ جون کے مہینے میں ہم کیمپ کلوز کر کے واپس ہو لیے۔ غالباً 30 جون 2011 کا دن تھا جب سینئر بٹ مرحوم کی شہادت ایبٹ آباد میں واقع ایک فاسفیٹ کی کان میں ہوئی۔ پاکستان کا عظیم سائنس دان فاسفیٹ کی کان میں تھا کہ یکایک کان کی چھت گر گئی اور اس کا بھاری بھرکم ملبہ اُن کے سر اور جسم پر لگا اور وہ کچھ دیر کے بعد جامِ شہادت نوش کر گئے۔ خورشید عالم بٹ صاحب کی ناگہانی شہادت میری زندگی کے چند نا فراموش کردہ واقعات میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ وہ بہت عظیم انسان تھے۔

کوالٹی ایشورنس ڈویژن میں خدمات:

گلگت بلتستان سے فراغت کے بعد لاہور آ کر جناب مرزا صاحب افسر اعلیٰ نے ایک نیا ڈویژن کوالٹی اشورنس کے نام سے شروع کیا اور اس کے پہلے پہل ہیڈ جناب حنیف چوہدری صاحب کو بنایا۔ حنیف صاحب ڈی.جی خاں سے لاہور تشریف لائے تھے اور کچھ عرصہ کے بعد ان کی ریٹائرمنٹ تھی۔ حنیف چوہدری صاحب بہت ذہین، محنتی اور پراجیکٹ کی تکمیل کے ماہر تھے۔ چونکہ ڈی.جی کے میں کوالٹی ایشورنس کا کام کرتے آئے تھے اس لیے یہاں پر انھیں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ مجھے ان کے زیرِ سایہ کام کرنے کے لیے چُنا گیا اور میں نے تقریباً چھ ماہ تک جناب حنیف چوہدری صاحب کے زیرِ سایہ کوالٹی ایشورنس کا کام سیکھا اور پھر اس میں کسی حد تک مہارت حاصل کی۔ یہ کام ایک بالکل مختلف نوعیت کا تھا۔ میں چونکہ ساری زندگی باہر پہاڑوں میں کام کرتا رہا اور اس کی وجہ سے گھر سے بھی مہینوں غائب رہنا پڑتا تھا، اس لیے شروع شروع میں اچھا لگا کہ اپنے شہر میں رہتے ہوئے یہ کام ملا ہے، اس لیے دن رات لگا کر اس کام کے اسرار و رموز سیکھے اور اس نئی سائنس کو گلے سے لگایا۔ بعد میں چوہدری حنیف صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس ڈویژن کا ہیڈ مجھے بنا دیا گیا اور میرے ساتھ زاہد غلام رسول صاحب اور طارق چغتائی کی بھی ڈیوٹی لگا دی گئی۔

اس ڈویژن کو بنانے میں بلکہ اس کا بنیادی ڈھانچہ تیار کرنے میں جو محنت و کاوش

چوہدری حنیف صاحب نے کی تھی، اس کو مزید طاقت اور قوت دینے کے لیے میں نے اور زاہد غلام رسول صاحب نے اپنی اپنی جیبوں سے مختلف مراکز میں دفتری اوقات کے بعد کوالٹی ایشورنس کی مزید تربیت حاصل کی۔ یہاں تک کہ زاہد غلام رسول صاحب نے بڑی بھاری فیس ادا کر کے شام کے اوقات میں کسی کالج میں اس کی تربیت حاصل کی۔

یہ چونکہ بہت مختلف کام تھا، اس لیے ٹک کر بیٹھنا پڑتا تھا جو کہ اس عمر میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے ایک مشکل کام تھا، لیکن اپنے آپ کو اس کام کے لیے راغب کیا اور بعد ازاں عادی بنایا اور اللہ تعالی نے کامیابی سے ہمکنار کیا۔

انھی دنوں کی بات ہے، غالباً 2012 یا 2013 کی، جب ایک تربیتی پروگرام کی شروعات ہوئیں۔ اس کے روحِ رواں جناب لطیف صاحب تھے، جو ہیڈکوارٹر اسلام آباد میں بیٹھتے تھے اور ایک انتہائی ٹیلنٹڈ قسم کے شخص تھے، خاص طور پر پلاننگ کے ماسٹر تھے۔ وہ بنیادی طور پر سول انجینئر تھے لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد اپنا مقام بلند کر لیا تھا۔ تقریباً کئی سالوں تک دوسری وزارتوں میں بطورِ معاون بھی خدمات سر انجام دیتے رہے تھے۔ یہ تربیتی پروگرام محکمے کے نوجوان افسران کی بھرپور تربیت کا پروگرام تھا جس میں ان کی اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی تو تھی ہی، دوسرے ٹریننگ والے پروگرام جس میں تحریر و تقریر، نشست و برخواست، قومی اور بین الاقوامی معاملات کی سوجھ بوجھ، قومی اور بین الاقوامی رموز کی جانکاری، عام و خاص معلومات میں اضافہ، غرضیکہ ادارہ کے افسروں جن

میں سائنسدان، انجینئر، فنانس اور ایڈمن کے افسران بھی شامل ہوتے، ان کے لیے دو ہفتوں کا کورس مختلف شہروں میں کرایا جاتا، جس میں ذیلی ادارہ لاہور بھی تھا۔ یہ ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی جس کو میں نے اور میری ٹیم نے خندہ پیشانی کے ساتھ ادا کیا۔ بعض اوقات سال میں تین تین ادوار بھی ہوتے تھے، دو تو لازمی تھے اور اس کورس کے لیے تیار کرنا جن میں کم از کم آٹھ یا دس ڈیپارٹمنٹس کے لوگ بھی شامل ہوتے، ایک مکمل پراجیکٹ ہوتا تھا۔ اس کو لے کر چلنا، دیکھ بھال کرنا، ہر افسر کا خیال کرنا، ایک اچھا خاصا کام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام میں بھی سرخروئی عطا فرمائی۔

اس کے علاوہ اپنے ادارہ کے دفتر میں جتنی بھی علمی، ثقافتی کانفرنسز منعقد ہوتی تھیں، ہمارے ہی دائرۂ اختیار میں ہوتی تھیں۔ یہ تمام معاملات ہو رہے تھے، دل مطمئن تھا کہ اللہ تعالیٰ مختلف انواع کے کام لے رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بظاہر تو یہ سرکاری نوعیت کے کام تھے، لیکن درحقیقت میری اپنی بڑی اچھی ٹریننگ ہو رہی تھی۔

پروموشن ٹیسٹ میں ناکامی اور بعد میں کامیابی:

گو کام بہت تھے، بلکہ کام پہ کام چڑھا ہوا تھا، لیکن ایک خاص قسم کا سکونِ قلب بھی تھا کہ اپنے محکمہ اور اپنے ملک کے لیے کام کر رہا ہوں اور کسی پہ کوئی احسان نہیں کر رہا۔

انھی ایام میں سالانہ پرموشن کے لیے انٹرویو دینے کا مرحلہ آگیا۔ یہ بھی ایک خاص خوشی و ڈر کا وقت ہوتا ہے اور چونکہ یہ پروموشن بڑی تھی یعنی بڑے گریڈ کے لیے تھی، اس لیے جوش وولولہ کے ساتھ ساتھ خفیف سا ڈر بھی لگا تھا۔ لیکن اپنی پرانی کارگزاری اور مختلف نوعیت کے تکنیکی اور غیر تکنیکی کاموں میں کامیابیوں کا ترکہ تھا، حوصلہ تھا اور سب سے بڑھ کر اعتماد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کامیابی سے نوازا ہے، اس لیے انشاءاللہ اس انٹرویو میں بھی کامیابی اور بعدازاں پروموشن ملے گی۔ اس پروموشن کا شدت سے انتظار اس لیے بھی تھا کہ میرے کمرے میں ائیر کنڈیشنر نصب نہیں تھا۔ کیونکہ موجودہ گریڈ میں ایئرکنڈیشنر کی اجازت نہیں ہوتی تھی، لہٰذا سخت گرمی کے دو سیزن گزارنے کے بعد امید تھی کہ جب پروموشن ہو گی تو AC مل جائے گا اور ہم سب ڈویژن والے نسبتاً بہتر ماحول میں کام کر سکیں گے۔ چنانچہ وقت مقررہ پر ہم تین لوگ' میں، جونئیر بٹ صاحب اور چوہدری صاحب (جیالوجسٹ) تیار ہو کر اسلام آباد کی طرف چلے۔ چونکہ پروموشن کا یقین تھا کہ ہو کر رہے گی، اس لیے جوش وجذبہ کی کوئی کمی نہ تھی۔ خود ہی گاڑی بُک کروائی اور اسلام آباد میں آفیسرز ریسٹ ہاؤس میں کمرے بھی بُک کروائے۔ آنے جانے کے سفری لوازمات بھی خود ہی کیے اور ہنستے مسکراتے، گپیں مارتے اسلام آباد پہنچے۔ وہاں کثیر تعداد میں افراد مختلف شہروں سے آئے ہوئے تھے، لہٰذا ساری رات سکون سے نیند بھی نہ کر سکے۔ بہر حال صبح صبح ناشتہ کر کے گاڑی میں سوار ہوئے اور ہیڈکوارٹر میں جناب خالد صاحب کے دفتر میں جا کر بیٹھ گئے۔

یہاں پر بہت رونق تھی۔ جناب اسلام صاحب افسر اعلیٰ ایکسپلوریشن بھی تھے اور چار پانچ مزید بڑی پروموشن کے امیدوار بھی تھے۔ گپ شپ اور چائے بمعہ لوازمات کے خوب چل رہی تھی۔ ابھی ہماری باری نہیں آئی تھی اور دوسرے لوگوں کے انٹرویو چل رہے تھے۔ غالباً یہ جمعۃ المبارک کا دن تھا، اس لیے جمعۃ المبارک کی نماز بھی ہیڈ کوارٹر میں ہی ادا کی۔ بعد میں ہمارے انٹرویو شروع ہوئے۔ اس دوران انٹرویو کا انتظار کرتے کرتے طبیعت کافی پژمردہ ہو گئی تھی اور پہلے والی تازگی برقرار نہ رہ سکی۔ کچھ کچھ تھکاوٹ کے آثار اور طبیعت میں ہشاش بشاش کیفیت کی کمی، کچھ کچھ پریشانی میں مبتلا کر رہی تھی کہ اسی دوران میرا نام پکارا گیا اور مجھے انٹرویو کے لیے طلب کیا گیا۔

اب قدرت اپنی مرضی کے معاملات کی طرف چل رہی تھی۔ میرا سارا انحصار اپنے پرانے کاموں کی کامیابی خاص طور پر ٹیسٹ پراجیکٹ اور گلگت بلتستان کے دریاؤں کی ریت چھاننے والا پراجیکٹ، کوالٹی ایشورنس، دوسرے علمی و تحقیقی کانفرنس منعقد کرنے والے پراجیکٹ پر تھا لیکن انٹرویو بورڈ کی مرضی کچھ اور ہی تھی۔ وہ اس طرف تو نہیں آرہے تھے جبکہ میری کوشش تھی کہ وہ اس طرف آئیں اور میں ان کو اپنی کارگزاری سناؤں لیکن قدرت کو منظور کچھ اور تھا۔ وہ ایک ہی سوال پر اَڑے ہوئے تھے کہ اگر میرے پاس کوئی برقی آلہ نہیں ہے تو میں کن وجوہات کی بنا پر کسی بھی علاقہ کی معدن پروری یا بانجھ پن کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں فوراً خیال آیا کہ شاید یہ Non conventional طریقہ

کار کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ چونکہ کیمیکل سروے، بیالوجیکل سروے یا ارضیاتی فزکس سروے کے ضمن میں آتے ہیں لیکن پھر یہ خیال آیا کہ ان سرویز کے نتیجے میں دریافت ہوتے ڈیپازٹ کے بارے میں سوال کریں گے تو اس کا جواب پاکستان میں کوئی نہیں اور پاکستان کے باہر میرے ذہن میں نہیں، اس لیے بات پہلے پہل ملکی بحث میں الجھی اور بعد ازاں میری طرف سے آئیں بائیں شائیں اور پھر یکا یک میرے ذہن نے تسلیم کر لیا کہ کام خراب ہو گیا ہے، کیونکہ بات طول پکڑ گئی تھی جو کہ ایک منفی تاثر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ قدرت کو اس بار پروموشن منظور نہیں اور ایک سال مزید گرمیوں میں بغیر ائر کنڈیشنر کے گزارہ کرنا پڑے گا۔ بہر حال اب ہر کوئی پوچھے، انٹرویو کیسا ہوا؟ کیا سوال کیے گے؟ اور کسی نے بھی اچھے کی امید نہیں دلوائی، اکثریت خاموش رہی اور چند ایک نے کہا کہ نہیں، تیری پروموشن نہیں ہونی۔ بہر حال یکم دسمبر 2013 کو اس گومگو اور روز روز کی 'ور وے جیا نکل وے جیا' والی کیفیت سے چھٹکارا حاصل ہوا جب میری پروموشن نہیں ہوئی اور جونئیر بٹ صاحب اور چوہدری صاحب دونوں کی پروموشن ہو گئی۔ پندرہ یا بیس منٹ تک طبیعت خراب رہی لیکن اس کے بعد خاص اللہ تعالیٰ کی شفقت عطا ہوئی۔ گھر والوں خاص طور پر اپنی اہلیہ کا بہت مشکور ہوں جس نے اس کیفیت سے نکلنے اور حوصلہ بلند رکھنے میں بہت مدد کی۔ ساتھ ساتھ میرا بیٹا محمد بلال قریشی بھی ہمت بڑھاتا رہا۔ پروموشن کا نتیجہ اتوار کو آیا تھا اس لیے اس دن تو دفتر نہیں جانا تھا، لیکن اگلا دن پیر کا تھا، میں دفتر گیا اور اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ لوگ آئیں اور گلے ملیں، تسلّی و

تشفّی دینے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ جناب فضل صاحب، مظہر صاحب، پرویز مرحوم، کیمسٹری ڈویژن سے سینئر افسران اور دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے صاحبان حوصلہ افزائی کے لیے تشریف لائے۔ میں ان سب کا شکر گزار ہوں کیونکہ انھوں نے مجھے پریشانی میں حوصلہ دیا۔ یار لوگوں نے غم کو ہلکا کرنے کے لیے مختلف جملے اور کلمات ادا کیے۔ سب سے زیادہ جملے دو اشخاص کے یاد رہے۔ ایک فضل صاحب جنھوں نے آتے ہی کہا کہ قریشی صاحب مبارک ہو پروموشن کی، اب مٹھائی کھلاؤ۔ اس موقع پر اتنا نامناسب کلمہ عام طور پر نہیں بولا جاتا لیکن شاید فضل صاحب میرے غم کو ہوا میں اُڑانے کے لیے اتنی بڑی بات کر گئے۔ 'اللہ کا شکر ہے۔' میں نے ہنس کر کہا کہ 'سر جی! پروموشن تو نہیں ہوئی لیکن آپ کو مٹھائی مل سکتی ہے کیونکہ جن لوگوں کی پروموشن ہوئی ہے، ان کے پاس وافر مقدار میں موجود ہے۔' اس کے بعد جناب بیگ صاحب تشریف لائے، آتے ہی گلے ملے اور بولے:

تندئ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

ان کے اس طرزِ عمل میں کافی ڈھارس بندھی اور پھر ہر چیز بھلا کر ان تمام افسران کے کمروں میں جا جا کر ان کو مبارک باد دی، مٹھائی کھائی، جن کی پروموشن ہو گئی تھی۔ بعد ازاں چونکہ ملک صاحب کی بھی پروموشن اگلے گریڈ میں ہو گئی تھی، ان کے کہنے پر ان کی طرف سے آفس کے سینیئر ترین افسران بشمول جناب اسلام صاحب کے لیے مقامی ریستوران میں پارٹی منعقد کی گئی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد جب معاملات کافی کنٹرول میں آ گئے تو جونئیر بٹ صاحب کی فرمائش پر سالانہ پروموشن پارٹی بھی منعقد کی گئی اور اس پارٹی کے بندوبست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہوا کہ ماسوائے پہلے پندرہ بیس منٹ جو میں نے گھر ہی میں گزار لیے، باقی تمام وقت نہ زبان پر کوئی شکایت، نہ ہی طرزِ گفتگو میں لڑکھڑاہٹ اور نہ منہ میں کوئی کڑواہٹ محسوس ہوئی۔

گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی اپنے کمرے میں بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ صبح سے ہی دھوپ سیدھی میرے کمرے میں آتی اور ایئرکنڈیشنر کی عدم دستیابی کے وجہ سے پورا کمرہ تندور کی طرح گرم ہو جاتا۔ زاہد غلام رسول صاحب کبھی پانی کی بالٹیاں کمروں سے متصل برآمدہ میں گراتے اور کبھی اپنا پوراسیٹ اَپ ہی کوریڈور میں لے آتے۔ روم کولر کو بھی اٹھا کر برآمدہ میں نصب کیا گیا۔ ہر ممکن حربہ استعمال میں لانے کے باوجود مئی تا جولائی گرمی کا زور بڑھتا ہی رہتا۔ اسی دوران کام کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہوتا رہتا اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی جستجو میں پسینے سے شرابور سرگرداں رہتے۔ اس کمرے نے مجھے ڈی جی خان کی گرمی بھلادی لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمت دی اور حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ اگر کسی نے شجرِ سایہ دار کی طرح ساتھ دیا تو وہ صرف ملک صاحب تھے۔ مجھے اپنے کمرے میں لے آتے جہاں اے-سی لگا ہوتا اور کہتے کہ تھوڑا دم لے لو۔ ٹھنڈی ہوا کھاؤ اور سکون سے کام کرو۔ اس میں واقعی کوئی شک نہیں ایسے مشکل اور کٹھن حالات میں جناب ملک صاحب نے نہ صرف زبانی حوصلہ افزائی کی بلکہ حالات کا مقابلہ کرنے کا طریقہ بھی بتایا۔ مجھے

اکثر کہتے، 'عباس قریشی، یہ تمھاری آزمائش ہے، ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ سارا دفتر تمھارے زیرِ نگین ہو گا اور تم پورے دفتر میں راج کرو گے۔' میں ہنس پڑتا اور کہتا، 'ملک صاحب یہ کیسی حوصلہ افزائی ہے، نہ تو میں اتنا سینئر ہوں نہ ہی سینئر ہونے کا کوئی جواز ہے کہ پورے دفتر میں راج کروں، آپ مذاق نہ کیا کریں۔' لیکن جواب میں کہتے، 'دیکھ لینا، ایک دن آئے گا ان شاء اللہ!' بہرحال ملک صاحب کی شفقت آمیزی میری تکالیف کا مرہم ثابت ہوتی تھی۔ ایک اور میرے سینئر آفیسر رہے ہیں جناب رشید صاحب، وہ بھی میری ہر ممکن حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔

قصہ مختصر کہ اس پروموشن ٹیسٹ کی ناکامی نے جہاں پریشانیاں پیدا کیں، وہیں اپنے آپ کا محاسبہ کرنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ ایک دن میں سوچ میں ڈوب گیا کہ جہاں تک کارگزاری اور محنت سے ہر ذمہ داری کا تعلق ہے تو اس میں تو میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور نہ ہی کسی سینئر افسر سے کوئی ایسی کھچاوٹ رہی ہے کہ سبب ہو۔ سالانہ کارگزاری جسے ACR کہتے ہیں، وہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک رہی ہے تو پھر آخر وجہ کیا بنی اس پروموشن کے نہ ہونے کی، تو خیال کی پرواز نے گھوم پھر کر یہ احساس دلایا کہ پروموشن نہ ہونے کی وجہ کوئی زمینی نہیں بلکہ یہ آسمانی فیصلہ ہے۔ قدرت اپنے بندے کو لے کر بھی آزماتی ہے اور دے کر بھی، لہٰذا اپنا محاسبہ خود کرو اور جو جو کج رویاں ہیں، ان کو ٹھیک کرو۔ آہستہ آہستہ میری طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ کھنچاؤ کی کیفیت میں کمی آنا شروع ہو گئی۔ نماز میں اور دوسری عبادات میں دل پہلے کی نسبت مزید لگ گیا۔ رویہ کافی سے زیادہ نرم ہو گیا اور دوسرا

یہ ہوا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے توجہ کافی حد تک بدل گئی۔ پھر یوں ہوا کہ حج کی درخواستیں جمع ہو رہی تھیں، میرا دل بھی کیا کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا گھر دیکھوں، خانہ کعبہ کو دیکھوں اور روحانی دولت سے سرفراز ہوں۔ بس پھر یوں ہوا کہ اپنا اور اپنی اہلیہ کا پاسپورٹ تیار کرایا اور ایک پرائیویٹ کمپنی سے بات کی، پیسے وغیرہ جمع کروائے اور اگست کے آخری ہفتہ میں عازمِ سفر ہوئے۔

یہ سفر اور اس جگہ کا قیام، اس کی کیمسٹری بھی عجیب و غریب ہے، پہلے پہل تو حرمِ کعبہ میں کعبہ کی زیارت کرنا، اس کی ہیبت اور بعد ازاں شفقتِ الٰہی سے سارے بندھن کا ٹوٹنا، ٹوٹ کا بکھرنا، آہ وزاری کرنا، بے ربط الفاظ کے ساتھ اپنے گناہوں کا اقرار کرنا، پھر آہستہ آہستہ شفقتِ الٰہی سے اپنے آپ کو سمیٹنا، پھر اللہ تعالیٰ کی محبت وڈھارس کو محسوس کرنا۔ اللہ اکبر کی آوازوں سے ایک نیا دل پذیر ولولہ کا پیدا ہونا، یہ سب ناقابلِ فراموش اور ناقابلِ بیان ہے۔ بالکل مختلف کیمسٹری ہے بلکہ یہاں سب سائنس وغیرہ بے معنی ہو جاتی ہے۔ بس جو بھی کثافتیں انسانی روح میں پلی ہوتی ہیں، آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں کے راستے باہر نکل جاتی ہیں اور ایسے لگتا ہے جیسے مکمل اوور ہالنگ ہو گئی ہو۔ اب ان کیفیات کے ہوتے ہوئے کون سی دنیاوی خواہشیں یاد آتی ہوں گی، جو پوری ہوئی ہوں اور وہ بھی جو پوری نہ ہوئی ہوں۔ بس ایسے ہوا کہ رحمت کی بارش ہوئی اور تمام خس و خاشاک کو بہا کر لے گئی اور ہر چیز دُھل گئی، چمک دار ہو گئی۔ سبحان اللہ! میرے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے تک ہم لوگ حج و عمرہ میں مصروف رہے۔ خوب خوب معافیاں مانگی گئیں۔ عبادات جتنی

ممکن ہو سکیں، وہ کیں۔ وہاں کا ویزہ مکمل ہو گیا، لیکن تشنگی دل میں رہی اور دوبارہ آنے کا سوچ کر واپس پاکستان آ گئے۔

واپس آتے ہی علم ہوا کہ پروموشن انٹرویو کا لیٹر آ گیا ہوا ہے اور آپ کا انتظار ہو رہا ہے لہٰذا جلدی کریں اور ہیڈ کوارٹر میں جا کر انٹرویو دیں۔ کیسے پورا سال گذر گیا کچھ یاد نہیں رہا۔ جلدی جلدی تیاری کی اور مقررہ دن کو جناب آصف صاحب افسر اعلیٰ ایکسپلوریشن کے ساتھ عازمِ ہیڈ کوارٹر اسلام آباد ہوئے۔

اگلے دن انٹرویو بورڈ کے سامنے موجود تھا۔ وہاں عجیب منظر تھا۔ وہی انٹرویو بورڈ، وہی لوگ، بلکہ کرسیاں اور ان کی ترتیب بھی ویسی۔ ایسے لگا جیسا کہ کل انٹرویو دیا ہے اور کمرے کا سارا سامان ویسے ہی ترتیب سے پڑا ہے لیکن انٹرویو بورڈ کا رویہ 180^{o} کے زاویے سے بدلا ہوا۔ انتہائی خوشگوار، محبت اور مسکراہٹ سے استقبال کیا گیا، کوئی تکنیکی سوال نہیں پوچھا گیا۔ بس حال چال پوچھا اور بورڈ لیڈر نے صرف اتنا پوچھا کہ ہمارے لیے بھی دعا کی تھی، میں نے ہاں میں جواب دیا اور بس دو منٹ میں انٹرویو ہو گیا اور میں باہر آ گیا۔ اللہ اللہ، کیا تبدیلی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لامتناہی طاقتوں میں سے ہے۔ وہ دلوں کو مسخر کر دیتا ہے، نفرتوں کو کدورتوں کو محبت میں بدل دیتا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے، ہر کام کر دیتا ہے۔ میں انٹرویو بورڈ کی اس بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر متعجب نہیں ہوا، کیوں کہ کوئی ان دیکھی طاقت مجھے اس اسلوب کو سمجھا رہی تھی اور نتیجہ جو یکم دسمبر 2014 کو آیا، اس کے مطابق میری پروموشن ہو گئی اور یوں میں پرنسپل سائنٹسٹ سے ڈپٹی چیف سائنٹسٹ بن گیا۔

پروموشن کے بعد کی مصروفیات:

جناب آصف صاحب افسر اعلیٰ ذیلی ادارہ لاہور کا دور تھا۔ آصف صاحب جیسے خود نرم طبیعت، جلدی غصہ میں نہ آنے والے، کام کو سمجھنے والے اور کام سمجھنے والوں کو سمجھنے والے تھے اور چونکہ خود سالہا سالوں سے لاہور میں فرائض سر انجام دیتے رہے تھے اس لیے لاہور میں چلنے والے تمام عوامل سے بخوبی آگاہ تھے۔ لہٰذا بغیر کسی شور شرابہ اور حکمی تحکمی کے کام اور وقت دونوں برق رفتاری سے چلتے رہے۔ آصف صاحب کے دور میں مختلف نوعیت کے کام سر انجام پا رہے تھے اور ایک خاص بات کہ ملکی اور غیر ملکی وفود کی آمد سرعت سے جاری تھی۔ ٹریننگ پروگرام دونوں ملکی اور غیر ملکی چل رہے تھے اور ساتھ ساتھ نئے معاہدات بھی ہو رہے تھے۔ جس میں ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی پروگرام بھی شامل تھے۔ حالانکہ آصف صاحب کا دور کوئی اتنا لمبا نہیں تھا لیکن کام کی رفتار اور حاصل کام کی وجہ سے بے حد کامیاب دور تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد جب جناب آصف صاحب کی ریٹائرمنٹ کا وقت ہو گیا اور وہ دو سالوں کے لیے اسلام آباد میں مشیر کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ اس دوران جناب اظہر صاحب افسر اعلیٰ ذیلی دفتر لاہور کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔

جناب اظہر صاحب میرے لیے ایک خوشگوار علامت تھے گو بظاہر میرے ساتھ ان کا سلوک ایک آفیسر اور ماتحت جیسا ہی تھا۔ حکمی تحکمی ان سے بہتر کوئی نہیں

کر سکتا تھا۔ چونکہ لاہور ان کی پہلی پہلی جوائننگ تھی اور جیالوجی کے حوالے سے جو بھی ارتقائی منازل طے ہوئیں ان تمام میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل رہے ہیں۔ بہترین جیالوجسٹ، بہترین رپورٹ رائیٹر، نفیس و کثیف دونوں قسم کی گفتگو کے ماہر، بہترین مشیر۔ جناب سینئر بٹ صاحب کے بعد آنے والے تمام افسران اعلیٰ ذیلی ادارہ لاہور کے سب کے سب اظہر صاحب کی مشاورت کے مرہونِ منت رہے ہیں۔ علاوہ ازیں بہترین راست باز، دین اور دینی معاملات پر مضبوط گرفت اور انتہائی بہادر انسان۔

اظہر صاحب بھی کام سمجھنے اور کرنے والوں کو بخوبی پہچانتے تھے۔ آتے ہی غالباً ایک ہفتہ کے بعد مجھے بلایا اور حکم دیا کہ دو پروپوزلز تیار کرو۔ ایک اپنے نام کی منیجر اور دوسری جناب خالد صاحب کی افسر اعلیٰ برائے جیالوجی چنانچہ دونوں لیٹر لکھے گئے اور چند ہفتوں کے بعد اسلام آباد سے میرے نام کا لیٹر بحیثیت منیجر سروے اور خالد صاحب کا تقرر نامہ بطور افسر اعلیٰ جیالوجی آگیا اور یوں میں ہیڈ سے منیجر سروے بن گیا۔

منیجر بننے کے بعد ایک تو ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا، دوسرا یہ ہوا کہ سینئر ہونے کے ناتے ایڈمن کی ذمہ داریاں شروع ہو گئیں۔ مختلف نوعیت کے ٹریننگ پروگرام، تکنیکی معاملات کی کانفرنسز، ہیڈکوارٹرز سے وی آئی پی شخصیات کے دورے اور دوسرے شعبہ جات کے ڈائریکٹرز کی آمد پہلے کے مقابلے میں کئی گنا ہو گئیں؛ جناب اظہر صاحب ان تمام معاملات کو اپنے تئیں خندہ پیشانی سے دیکھتے

رہے۔ مجھ ناچیز کو یہ اعزاز حاصل ہے اور میرے لیے ایک ایوارڈ سے کم نہیں کہ تقریباً تمام معاملات میں مجھے نہ صرف ساتھ رکھا بلکہ گاہے بگاہے میرے مشورے پر غور وخوض بھی کیا۔

ہمارے ایک چیف ایڈمن آفیسر تھے، بہت نفیس اور اپنے کام کے ماہر۔ ان کی اچانک دفتر میں حالت خراب ہو گئی اور بعد ازاں ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ یہ ایک ایسی ایمر جنسی تھی کہ ایک شخص صبح آفس آیا ہے، معمول کے کام سر انجام دے رہا ہے۔ فون کر رہا ہے اور سن رہا ہے۔ یکایک طبیعت خراب ہوتی ہے اور بعد ازاں ہسپتال میں غریقِ رحمت ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ آناً فاناً ہوتا ہے، اس قسم کی حالت میں چند لمحوں کے لیے تو دماغ کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ اس دن ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی ہوا۔ جناب اظہر صاحب نے مجھے اس خبر کی اطلاع دی اور ساتھ ہی کہنے لگے کہ میں ذرا آفس سے باہر جا رہا ہوں تو تم سارے معاملات کی نگرانی کر لینا۔ چنانچہ میں نے اپنا آفس چھوڑا اور اپنے افسر اعلیٰ کے حکم کے مطابق مرحوم کی وفات کے بعد والے معاملات کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی مجھے افسر اعلیٰ صاحب کا ایک اور پیغام ملا کہ مرحوم کے جسم کو غسل دے کر ان کے اہلِ خانہ کو لے کر جنازہ ڈی جی خان لے جانا ہے اور کم از کم تین ویگن آفیسرز اور سٹاف سے بھر کے ساتھ جانا ہے۔ اب یہاں اس دنیا کی وقعت اور یہاں کے رہنے والوں کی روایتی بے حسی، نا قدری اور منافقت کی جو حالت دیکھی، وہ بیان تو نہیں ہو سکتی لیکن اتنا کہنا چاہوں گا کہ وہی لوگ جو دن گیارہ بجے تک مرحوم کو سر جی سر جی کہہ کر بات کر رہے تھے اور

جان وتن سے تابع داری کے مجسمے بنے ہوئے تھے، یکلخت کسی کے والد بیمار نکل آئے، کسی کو کوئی اور کام یاد آگیا اور بعضوں نے تو بالکل ہی انکار کر دیا کہ ہم جنازہ کے ساتھ نہیں جاسکتے۔ آپ ہمیں مجبور نہ کریں، یہاں تک کہ مرحوم کے شعبہ اور اس سے منسلک شعبہ جات کے لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے کی تیاری کرنے لگے۔

اس صورتِ احوال نے مجھے کافی پریشان کیا کہ کیا ہماری دوستی، تعلق واسطہ صرف کرسی کی حد تک ہی ہے؟ اِدھر آنکھ بند ہوئی یا کرسی چھینی جانی، اُدھر تُوں کون میں اور کون توں۔ لوگوں کی اس بے حسی کو دیکھتے ہوئے میں نے فوراً گیٹ پر فون کر کے گیٹ بند کروا دیئے اور ساتھ ہی پیغام دے دیا کہ جب تک تین ویگن مکمل طور پر بھر کر روانہ نہیں ہوں گی، گیٹ نہیں کھلے گا۔ اس دوران چار بج گئے اور چھٹی کا وقت ہو گیا۔ سارا دفتر گیٹ پر جمع ہو گیا اور پہلے پہل غصہ کیا اور بعد میں منت سماجت پر اتر آیا۔ اور یقین دہانی کروانے لگا کہ سب لوگ تو نہیں کچھ ان کے نمائندے ضرور جنازے کے ساتھ جائیں گے۔ تو یوں ہوا کہ گیٹ اسی وقت کھلا جب تین ویگن مکمل بھر گئیں اور جنازہ کے ساتھ ڈی جی خان جانے کو تیار ہو گئیں۔ اسی دوران افسر اعلیٰ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ کچھ لوگوں نے میری شکایات بھی کیں لیکن صاحب خاموش رہے۔ یقیناً وہ میرے اس عمل کی تائید کر رہے تھے۔ یہ سب ایک بہادر لیڈر ہی کر سکتا ہے۔

اسی طرح جب نئے نئے اعلیٰ افسر کی ذمہ داری آئی اور تو سردیوں کے دن تھے، اظہر صاحب صبح کی سیر کے دوران ٹھوکر کھا کر گرے اور اپنا بایاں بازو تڑوا بیٹھے۔

بازو پر پلستر چڑھوا کر دفتر آئے اور اسی دن اسلام آباد سے ہائی پروفائل وفد کے وزٹ کا علم ہوا جو کہ اگلے روز تھا۔ واہ ری قسمت، ابھی افسر اعلیٰ بنے بمشکل ایک ماہ ہی ہوا تھا اور بازو کے ٹوٹنے کی تکلیف اور ساتھ اتنا بڑا وزٹ۔ بیچارے تکلیف میں تو مبتلا تھے ہی ساتھ یہ ایمر جنسی بھی آن پڑی۔ میں چونکہ ساتھ ساتھ تھا اس لیے مجھے مکمل احساس تھا کہ اظہر صاحب کی جسمانی اور ذہنی کیفیت کہیں الجھاؤ میں ہے۔ لیکن کیا بات ہے، ماشااللہ سے، اِسی ٹوٹے ہوئے بازو کے ساتھ تمام احکامات بھی جاری کرتے رہے اور وزٹ کے انتظامات بھی کیے اور اس دوران لمحے بھر کا وقفہ یا کہہ لیں چھٹی نہیں لی۔ اظہر صاحب بھی جناب قمر صاحب کی طرح اپنے ماتحت افسران کی صلاحیتوں کو جانچتے اور جب اچھی طرح جانچ لیتے تو پھر بھروسہ بھی کرتے۔ چناچہ مجھے یاد ہے ایک دفعہ دو وی آئی پی وزٹ اکٹھے آ گئے دونوں کو پروٹوکول دینا آفس کے اعلیٰ عہدے دار ہی کی ذمہ داری تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ دونوں وفود کی آمد و روانگی تقریباً ایک ہی وقت کی تھی اور دونوں کو اٹینڈ کرنا بھی ضروری تھا۔ جناب اظہر صاحب نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا اور کہا کہ ایک وفد کو تو میں اٹینڈ کر لیتا ہوں اور دوسرا وفد تمھاری ذمہ داری پہ ہے۔ میں 'یس سر' کہہ کر میں اپنے کام میں جُت گیا۔

پھر دونوں وفود آئے، ایک کو میں نے دفتر کی دوسری بلڈنگ میں اور دوسرے کو اظہر صاحب نے آفس کی نئی بلڈنگ میں خوش آمدید کہا۔ پھر معاملات شروع ہوئے۔ اپنے آفس کی ذمہ داریوں، کامیاب اور مستقبل کے پروگرام پر

مختصراً روشنی ڈالی۔ چائے وغیرہ پیشِ خدمت کی اور آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں میٹنگ میں حصہ لیا۔ اسی اثنا میں پہلے والا وفد جس کی مہمان نوازی جناب اظہر صاحب کر رہے تھے وہ بھی فارغ ہو گئے اور واپس روانہ ہو گئے۔ جب مجھے اس وفد کی روانگی کا علم ہوا تو میں اپنے والا وفد لے کر اظہر صاحب کے آفس حاضر ہوا اور زبانی کلامی صورتِ احوال سے آگاہ کیا۔ وفد کے انچارج بھی چونکہ افسر اعلیٰ تھے، تو جب اظہر صاحب نے ان سے وزٹ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بغیر کسی لگی پٹی کے میرے بارے میں بتایا کہ عباس قریشی صاحب نے ہمیں بہترین پروٹوکول دیا ہے اور جتنی ضروری معلومات چاہیے تھیں، وہ ہمیں مل گئی ہیں اور ہمیں آپ کی کمی ذرا بھر محسوس نہیں ہوئی۔ یہ سن کر جناب اظہر صاحب نے کہا 'شکر الحمد اللہ۔' یہ کلمات تھے تو مختصر، لیکن میرا ڈھیروں خون اور حوصلہ بڑھا گئے۔۔۔ اور ایک مزید ایوارڈ سے نواز گئے۔

جناب اظہر صاحب جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے بظاہر مزاج میں سختی رکھتے تھے لیکن کام کے قدر دان اور ٹیلنٹ کے بہترین شناسا تھے۔ ایک دفعہ ایک پراجیکٹ کے اعلیٰ عہدے دار ذیلی ادارہ لاہور میں تشریف لائے اور مین ہال میں ان کا دو گھنٹے کا معلوماتی اور ایکسپرٹ طریقۂ کار پر لیکچر تھا۔ حسبِ معمول اس لیکچر کی تیاری اور مہمانوں کی مہمانداری بمعہ سامعین کی ذمہ داری میری تھی، اس لیے دوڑ دھوپ کر کے مقررہ وقت اور دن تک ساری تیاری کر لی۔ مہماں صاحب آئے اور آفس میں اظہر صاحب کے پاس بیٹھے۔ اسی دوران جب لیکچر کے سارے انتظامات مکمل

ہو گئے تو میں اظہر صاحب کے آفس میں صاحب اور مہماں اعلیٰ کو لینے کے لیے گیا۔ دونوں صاحبان کو لیا اور عازمِ ہال ہوتے راستے میں گراؤنڈ کے وسط میں پھولوں والے قطعے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ آگے دونوں معزّز افسران تھے اور پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پہ میں چل رہا تھا۔ دونوں حضرات ماضی اور حال کے معاملات پر بحث کرتے چل رہے تھے اور ساتھ ہی مستقبل کی لیڈر شپ کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ جناب اظہر صاحب بولے، "اگر میرا بس چلے تو میں عباس قریشی صاحب کی کلوننگ کروا لوں۔" مہمان خصوصی نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا اور بات ہنسی مذاق میں ختم ہو گئی۔ لیکن جناب اظہر صاحب کے یہ ریمارکس مجھے ایک اور ایوارڈ سے نواز گئے اور کیا ہی زبردست ایوارڈ تھا یہ۔

انھی دنوں کی بات ہے جب میں اظہر صاحب، ریاض صاحب اور ایک ادارے کے سینئر افسران کوئٹہ کے نزدیک سینڈک پراجیکٹ گئے۔ میں چونکہ مینجر سروے کے عہدے پر کام کر رہا تھا، اس لیے ہیڈ کوارٹر سے میرا نام اس ادارے کو ایک ماہر کے طور پر دیا گیا تھا۔ بعد میں اظہر صاحب کو بھی فون آیا کہ آپ بھی سینڈک جائیں، وہاں جا کر تانبے کی مائننگ اور پروسیسنگ والی سائیٹ پر جانا تھا، اس لیے وہاں کی انتظامیہ سے کئی معاملات پر میٹنگ بھی طے تھی۔

جناب اظہر صاحب نے رات کو ہی مجھے کچھ نکات لکھوا دیے جو کہ زیرِ بحث آنا تھے اور جن کے جوابات ضروری تھے۔ میں شروع شروع میں ذرا جھجک رہا تھا کیونکہ اظہر صاحب کو ذہنی طور پر اپنا استاد مانا ہوا تھا اور ان کی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ

میں اپنے اندر اتنی جرأت محسوس نہیں کر پا رہا تھا کہ ان کی موجودگی میں ایک ماہر ایکسپلوریشنسٹ کی حیثیت سے وفد کے درمیان بیٹھ کر فریقِ مخالف سے بحث و مباحثہ کروں۔ اظہر صاحب بھی بھانپ گئے کہ عباس قریشی جھینپ رہا ہے لیکن کیا بات ہے اظہر صاحب کی، کہنے لگے: ”مرکزی ماہر تو تم ہی ہو، میں اور ریاض صاحب تمھاری معاونت کے لیے تیار ہیں۔ لہٰذا گھبرا ؤمت اور حوصلے کے ساتھ معاملہ نبٹاؤ۔“

ان کی اس بات نے میرے اندر ایک عجیب رہنماؤں جیسی شجاعت بھر دی اور یہ ایک اور ایوارڈ تھا جو مجھے اظہر صاحب نے عطا کیا۔ بعد ازاں میٹنگ ہوئی اور جو ضروی حل طلب معاملات تھے وہ حل ہو گئے اور ہم واپسی کے لیے تیار ہو گئے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد میرا ایک غیر ملکی وزٹ تھا جو کامیابی سے مکمل کیا اور واپس وطنِ عزیز کو پلٹ آیا۔

قصہ مختصر، اظہر صاحب کے ساتھ جو تعلق رہا، اس جیسا تعلق صرف شیخ صاحب مرحوم کے ساتھ ہی تھا، لیکن شیخ صاحب مرحوم کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی اور وہ جلد ہی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اظہر صاحب میرے محسن بھی ہیں۔ ایک دفعہ میرے بڑے بھائی محمد الیاس کے گھر میں رہائش پذیر کرایہ دار بدنیت ہو گئے اور گھر پر قبضہ کر لیا۔ میں نیا نیا ڈی جی خان سے لاہور ٹرانسفر ہوا تھا کہ یہ معاملہ ہو گیا۔ مجھے کوئی اور قابلِ بھروسہ شخص ماسوائے اظہر صاحب کے نہ ملا، اور جب ہم لوگ شام کو کرایہ داروں کے ساتھ ملے اور بات چیت کی تو اللہ تعالیٰ نے کامیابی سے نوازا اور ایک مشکل ترین گُتّھی سُلجھی۔

بعد ازاں 2000ء میں میرا گھر بنانے کا ارداہ ہوا تو موجودہ سوسائٹی میں 10 مرلہ کا ایک پلاٹ خریدنے کے لیے ایک بار پھر اظہر صاحب کی خدمات حاصل کیں اور جو بیع نامہ تیار کیا، اس میں بھی ان کے دستخط کروائے۔ یہ بیع نامہ ابھی تک میرے پاس موجود ہے۔

جناب اظہر کا مجھ ناچیز پر ایک بہت بڑا احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے میرے عقیدے کی درستی اور صراطِ مستقیم پر روانی کے لیے میری بے حد مدد کی۔ شروع شروع میں ان کے ساتھ ایک آدھ دفعہ بحث و مباحثہ بھی ہوا لیکن اس معاملے میں اظہر صاحب کا رویہ انتہائی مشفقانہ اور مدبّرانہ رہا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مجھے حقائق سے آشنا بھی کرتے رہے۔ پھر ایک وقت آیا جب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں نے سیدھے راستے کو چُنا اور اپنی زندگی کی گاڑی کو اس راستے پر چلانا شروع کیا۔

جناب اظہر صاحب کی طبیعت میں مزاح کا بھی کافی اثر ہے۔ شکل و صورت سے وجیہہ انسان تو ہیں ہی، لیکن گفتار سے بھی ایک بندۂ مومن ہیں۔

ایک دفعہ اندرونی تربیت کا پروگرام شروع ہو رہا تھا اور اس کا افتتاح، افتتاحی اور اختتامی تقاریر افسر اعلیٰ ذیلی ادارہ لاہور کا ہی پروٹوکول تھا۔ اگر کسی وجہ سے افسر اعلیٰ نہ ہوں تو پھر ڈپٹی اافسر اعلیٰ یا ان سے جونیئر کوئی افسر یہ فریضہ انجام دیتا ہے۔

اظہر صاحب خوش قسمتی سے ہر تربیتی پروگرام میں آفس میں ہی ہوتے، اس لیے یہ سارے پروٹوکول سرانجام دینے کے لیے موجود ہوتے۔ ایک بار سال میں دو پروگرام آئے، میں نے افتتاحی تقریر لکھ کر ڈائس پر رکھی اور وقتِ مقررہ پر اظہر

صاحب کو بلا کر ان سے عرض کیا کہ سر پروگرام شروع کرنے کی اجازت دیں اور کچھ افتتاحیہ کلمات ارشاد فرمائیں۔

چنانچہ افسر اعلیٰ نے حسبِ موقع کچھ باتیں فی البدیہہ کہیں اور باقی وہ جو میں نے تقریر لکھی تھی، وہاں سے دیکھ کر اضافہ فرمایا۔ ذہین تو ہیں ہی، لہٰذا تقریر یاد رہ گئی۔

چند ماہ بعد ایک اور نیا تربیتی پروگرام شروع ہوا جس میں شرکت کرنے والے افسران مختلف تھے، یعنی پہلے والے سیشن میں جو افسران تھے، ان سے مختلف اور سینئر کلاس کے۔ میں نے پھر وہی پُرانی تقریر صاحب کو پیش کی کہ سر جی یہ آپ کی تقریر ہے جو کہ آپ نے افتتاحیہ لمحات میں کرنی ہے تو تقریر کو دیکھتے ہی پہچان گئے، یہ تو وہی چند ماہ پہلے والی تقریر ہے۔ بس پروگرام نمبر اور دن و تاریخ بدلے ہیں تو غصے سے بولے، یہ کیا، وہی پرانی تقریر کرنی ہے، نئی کیوں نہیں؟ تو میں نے ڈرتے ڈرتے کہا، سر جی تقریر تو پرانی ہی ہے لیکن سامعین نئے ہیں۔ اس لیے چل جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد مسکرائے اور بعد میں دوسرے افسران کو بھی اس لطیفے سے آگاہ کرتے رہے۔

اظہر صاحب غضب کی یادداشت رکھتے تھے۔ ایک بار ہم ایک اور پراجیکٹ پر گئے جو ذیلی ادارہ لاہور کا ڈیٹا ہی استعمال کر رہا تھا اور اسی ڈیٹا کی مدد سے ایکسپلوریشن کا کام کر رہا تھا۔ دوران میٹنگ جو جیالوجی کے نقشے دکھائے جا رہے تھے، وہ بہت خوبصورتی سے اور بہترین جدید کمپیوٹرائز پرنٹنگ مشینوں سے پرنٹ کروائے ہوئے

تھے۔ تقریباً دس بارہ نقشے دیکھے تو اظہر صاحب فوراً بولے، کہ یہ تو 80 کی دہائی کے بنے ہوئے نقشے ہیں اور ڈرافٹس مینوں نے مینوئلی بنائے ہیں۔ آپ نے یہ سارے کمپیوٹر میں ڈال کر پرنٹ نکالے ہیں، آپ نے خود سے جو نقشہ بنایا ہے وہ دکھائیں۔ یہ سن کر وہاں کافی شرمندگی پائی گئی، اور دوبارہ سے ان کو ایڈوائس کیا گیا کہ اپنا تازہ ڈیٹا اکٹھا کر کے نئے خطوط پر نقشہ جات تیار کیے جائیں۔

غرض یہ کہ مجھے ایسے لیجنڈ لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جو اس فیلڈ کے نہ صرف نابغہ تھے بلکہ نئے ماہرین پیدا کرنا بھی جانتے تھے۔ ایک کامیاب اور رو بہ عروج قومیں ایسے ہی بنتی ہیں۔

ابھی اظہر صاحب کا وقت چل رہا تھا کہ جناب ارشد صاحب ڈائریکٹر کراچی بحیثیت ڈپٹی افسر اعلیٰ ذیلی ادارہ لاہور تعینات ہوگئے۔ ارشد صاحب ایک طرح سے میرے لنگوٹیے دوست بنتے ہیں کیونکہ ہم نے تقریباً کچھ ماہ کے فرق سے ڈی جی خاں پراجکٹ جوائن کیا تھا اور پھر اکٹھے ہی وہاں سے ٹرانسفر ہو کر ذیلی ادارہ لاہور اور ذیلی ادارہ کراچی میں گئے۔ بے حد باکمال شخصیت کے مالک ہیں۔ شکل وصورت سے ڈاکٹر لگتے ہیں۔ بہترین پوشاک پہننے کے عادی، نفیس عادات کے مالک۔ انتہائی عبادت گذار اور دردِ دل رکھنے والے۔ ارشد صاحب بلاشبہ ایک بہادر افسر ہیں۔ شروع شروع میں اجاڑ پہاڑی مقام جیسے دُور دراز اور سخت معاملہ والے علاقے میں ارشد صاحب کو حیرت سے دیکھتے تھے اور چہ میگوئیوں میں ذکر کرتے تھے، کہ یہ کراچی کا لونڈا ہے، کب تک یہاں ٹکے گا۔ دیکھ لینا یہ لڑکا یہاں کی سختیاں برداشت نہیں کر

سکتا اور عنقریب نوکری چھوڑ کر واپس کراچی چلا جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بے شمار طاقتیں اور خصوصیات یہی ہیں کہ جو کام انسانی عقل کے بس میں نہیں ہوتا، وہی ہو جاتا ہے۔

ارشد صاحب نے نہ صرف اس اجاڑ پہاڑی مقام میں قیام کیا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی وجہ سے اس اجاڑ پہاڑی مقام پر جو بھی آیا، اس کا دل وہاں لگا اور وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا تو بے جا نہ ہو گا۔ ارشد صاحب نے اس مقام کا چہرہ جو ایک خوف ناک و ہیبت ناک مشہور ہے، اس کو بے حد خوش گوار و خوشبودار اور سایہ دار سائبان میں تبدیل کر دیا تھا۔ بعد ازاں جسمانی اور ذہنی مضبوطی کا مظاہرہ کراچی جا کر وہاں کے پہاڑوں میں تقریباً بیسیوں کلو میٹر لمبی پٹی میں بذاتِ خود بغیر کسی فیلڈ ہیلپر کی مدد سے سروے کر کے اور قابلِ عمل علاقے ڈھونڈ کر کیا۔ یہ واقعی ایک بہت بڑی بات ہے کہ آپ کے پاس فیلڈ ہیلپر نہیں ہیں، بس ایک آدھ ہیلپر ہے اور باقی سب کام آپ خود کر رہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ وہ ارشد صاحب کی آدھی شخصیت کا بھی احاطہ کر سکیں۔ اس لیے دوران مضمون جہاں بھی آپ کا ذکرِ خیر ہوا، ان شاءاللہ موقع کی مناسبت سے آپ کی خوبیاں بیان کرتا رہوں گا۔

چونکہ بات ہو رہی تھی اظہر صاحب کی، تو انھی کی بات آگے بڑھاتے ہیں۔ جیسا کہ ان کی شخصیت کے بارے میں جانا کہ وہ کام کرنے والے افراد کو پہچان لیتے تھے اور ان کی قابلیت کے مطابق کام بھی لینا جانتے تھے۔ ہوا یوں کہ محکمہ کی ایک

ہاؤسنگ سوسائٹی کے لیے پراجیکٹ ڈائریکٹر کی آسامی خالی ہو گئی اور اس کے لیے ہیڈکوارٹر نے موزوں شخص کی تعیناتی کے لیے لکھا۔ اب کا تو پتا نہیں لیکن اس وقت یہ ضروری تھا کہ جو بھی پراجیکٹ ڈائریکٹر ہو، وہ حاضر سروس ہو اور ذیلی ادارہ لاہور سے ہو تو اظہر صاحب نے میرا نام پیش کر دیا۔ میں اس وقت چار پانچ دوسرے کاموں میں مصروف تھا، جن میں سے ہر کام فل ٹائم تھا اور پراجیکٹ ڈائریکٹر کی ذمہ داری سنبھالنا تقریباً تقریباً ناممکن تھا لیکن اظہر صاحب نے نہ صرف میری سفارش کی بلکہ تقررنامہ بھی منگوا لیا۔ میں چھ ماہ تک اس ہاؤسنگ پراجیکٹ کے ڈائریکٹر کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔

جناب اظہر صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد قرینِ قیاس یہی تھا کہ جناب ارشد صاحب افسر اعلیٰ ذیلی ادارہ لاہور بنیں گے لیکن ہوا یوں کہ جناب خان صاحب جو اُن دِنوں افسر اعلیٰ مائننگ تھے، ان کا مجھے ایک دن فون آیا کہ قریشی! تم نے کچھ سنا ہے؟ میں نے پوچھا، کیا سر؟ مجھے تو کوئی بات نہیں معلوم۔ تو کہنے لگے، میں افسر اعلیٰ ذیلی ادارہ لاہور بن گیا ہوں اور جلد ہی لاہور آ رہا ہوں۔ اس بات کا بہت کم لوگوں کو علم تھا پھر یہ ہوا کہ اسی سال اظہر صاحب کی ریٹائرمنٹ ہو گئی اور خان صاحب ان کی جگہ افسر اعلیٰ ذیلی ادارہ لاہور بن گئے۔

خان صاحب کے ساتھ چونکہ اوّل دن سے کام کر رہا تھا بلکہ جب وہ جیالوجسٹ تھے، تب بھی فیلڈ پارٹی کے انچارج تھے اور میں نے شروع شروع میں خان صاحب سے ہی سیکھنے کی ابتدا کی تھی۔ اس لیے مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کے لیے کسی طور

نئی مساوات کی ضرورت نہ تھی حالانکہ 1999ء کے بعد ہم لوگ 2017 میں دوبارہ اکٹھے کام کرنے لگے تھے۔

لیکن یہ اٹھارہ سال کا وقفہ ہمارے تعلقات میں کسی قسم کی کمی یا تبدیلی نہ لا سکا۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہمارے درمیان کمیونیکیشن کا سلسلہ جاری و ساری رہتا۔ اگر کبھی درمیان میں کوئی خلا بھی آیا تو موبائل کے آنے کے بعد وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں چاہے کے۔ پی۔ کے میں کام کر رہا ہوتا یا گلگت بلتستان میں، سندھ میں یا کسی اور علاقہ میں، ہر جگہ میرا اور خان صاحب کا رابطہ رہتا بلکہ ایک دفعہ جب کار سروے کیا جا رہا تھا اور ہم لوگ جنوبی کے۔پی۔ کے میں کیمپ لگائے بیٹھے تھے تو خان صاحب نوشہرہ سے ڈی جی خان جاتے ہوئے میرے پاس آ گئے اور مجھے کہنے لگے کہ تم کار سروے کر رہے ہو تو مجھے بھی ساتھ بٹھا لو اور سمجھاؤ کہ یہ کیسے کیا جاتا ہے۔ پھر خان صاحب سارا دن (تقریباً آٹھ گھنٹے تک) میرے ساتھ کوہاٹ ڈویژن میں کار سروے کرتے رہے اور مجال ہے کہ ذرا بھی تنگ ہوئے ہوں۔ ماشاء اللہ سے ذہین تو ہیں ہی، چند منٹوں کے بعد سارا پراسیس سمجھ گئے اور پھر بلا تکان اس مشکل نوعیت کے سروے میں مصروف رہے۔

فیملی تعلقات ہونے کی وجہ سے میری والدہ خان صاحب اور ان کی فیملی سے بے حد محبت رکھتی تھیں کیوں کہ یہ بھی خان صاحب کی محبت تھی کہ جب بھی لاہور آئے، اکیلے یا مع فیملی کے میرے گھر میں بھی قیام کیا حالانکہ ان کے ایک بہت نزدیکی اور بااثر رشتہ دار لاہور میں قیام پذیر رہے ہیں، لیکن ترجیح مجھے ملتی تھی۔ اس

محبت کے لیے میں خان صاحب کا بے حد مشکور ہوں۔

خان صاحب کے مزاج میں تیزی شروع سے ہی ہے۔ ہر کام جلدی جلدی اور وقت کی پابندی، کام کی نفاست اور وقت پہ تکمیل؛ یہ شروع سے ہی خان صاحب کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور بعد میں شیخ صاحب مرحوم کا ساتھ، سب مل ملا کر اگر میں یہ کہوں کہ خان صاحب ایک طوفانی شخصیت بن گئے ہیں تو بے جا نہ ہو گا۔

خان صاحب حافظِ قرآن بھی ہیں۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور ڈسپلن کے سخت، یہی اوصاف ماشاء اللہ ان کے بچوں میں بھی ہیں۔ بچے بھی سارے لائق، ذہین اور کامیاب۔

خان صاحب نے اظہر صاحب سے افسرِ اعلیٰ کی کمان سنبھالی تو ذیلی ادارہ لاہور میں مختلف نوعیت کے کاموں کے سلسلہ میں خوب رونقیں لگی ہوتی تھیں۔ جنرل سروے کے علاوہ کچھ خصوصی نوعیت کے کام بھی ذمہ داریوں کو بڑھا رہے تھے۔ چونکہ ذیلی ادارہ لاہور شروع سے ہی خالص تربیت یافتہ سائنس دانوں اور انجینئروں کا مرکز رہا ہے، اس لیے جدید دور کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہاں کے سائنسدانوں اور انجینئروں کی استطاعت کو بروئے کار لاتے ہوئے سال ہا سال سے محدود کام کی شہرت کو بڑھاوا دیتے ہوئے دوسری معدن کے لیے سروے پر بھی کام سرعت اور شدت سے شروع کر دیا۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ذیلی ادارہ کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوا بلکہ ان ذمہ داریوں میں جدّت اور کثیر الظرفی بھی پیدا ہو گئی، ساتھ ساتھ ٹریننگ کے پروگرام جو ملکی اور غیر ملکی سطح پر ہونے جا رہے تھے، ان

میں تیزی آنے لگی۔ مختلف ممالک کے ساتھ معاہدات کو آخری شکل دی جارہی تھی اور ان تمام معاملات میں میرا حصہ بقدر جُثہ موجود تھا اسی دوران اکتوبر 2017 میں ایک غیر ملک میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں میری خوش قسمتی کہ مجھے شرکت کا موقع دیا گیا۔ وہاں جاکر احساس ہوا کہ ہمارا ملک کتنا اہم ہے۔ تقریباً چالیس بیالیس ممالک کے نمایندے وہاں موجود تھے۔ میں ہال میں کچھ لیٹ پہنچا اور چونکہ میری کرسی خالی تھی لیکن پیارے وطن پاکستان کی پلیٹ وہاں لگی تھی۔ میں جب وہاں پہنچا اور کرسی پر بیٹھا تو تقریباً ساری آنکھیں میری طرف آئیں اور اچھی طرح آنکھوں آنکھوں میں مجھے تولا گیا۔ بعد ازاں جب بحث و مباحثہ میں اور مختلف وقفوں میں حاضرینِ کانفرنس سے گفت و شنید ہوئی تو ان لوگوں کے چہروں میں نرماہٹ اور باتوں میں خوشگوار تبدیلی محسوس ہوئی۔ اس ملک سے واپسی پر فیملی کے ہمراہ عمرہ کا پروگرام تھا۔ اس لیے ان دو ماہ میں عمرہ کی تیاری بھی ہوتی رہی اور ساتھ ساتھ دفتر کے معاملات بھی چلتے رہے۔ ٹریننگ ملکی اور غیر ملکی زور و شور سے جاری تھی۔ ایم-فل، پی ایچ-ڈی کرنے والے بھی آمدورفت میں تھے۔ سر کھُجانے کی فرصت واقعی نہیں تھی، وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا کہ جنوری 2018 آگیا اور میں اور میری فیملی عمرہ کے لیے سعودی عرب روانہ ہوگئے۔ سعودیہ پہنچ کر دمام سے میری بڑی بیٹی حفصہ اپنی فیملی کے ہمراہ عمرہ کرنے مکہ پہنچ گئی اور یوں سوائے بیٹوں کے میری تمام فیملی نے عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ مکہ اور مدینہ میں ایک ایک ہفتہ قیام رہا اور اس دوران جی بھر کے روحانی فیوض وبرکات سے سیر اب ہونے کا موقع ملا۔

افسر برائے منصوبہ بندی کی مصروفیات:

غالباً 20 جنوری 2018 کو پاکستان واپسی ہوئی۔ آفس میں پہنچا تو ایک خصوصی لیٹر نے ساری توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ یہ لیٹر ماہِ جنوری کا لکھا ہوا تھا اور اس کے مطابق میں افسر برائے منصوبہ بندی تعینات ہو گیا تھا۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، ملک صاحب کے بعد میری تعیناتی اس پوسٹ پر ہوئی تھی۔ افسر اعلیٰ برائے منصوبہ بندی مجھ جیسے شخص کے لیے، جس نے اپنی نوکری کا آغاز ڈیلی ویجر کے طور پر کیا اور درجہ بدرجہ منازل طے کر کے اس عہدہ پر آیا، ایک اعزاز کی بات تھی۔ کل دس شعبہ جات مع ٹرانسپورٹ کے تھے جبکہ ٹرانسپورٹ مکمل طور پر ایک شعبہ ہے۔ اور خاص طور پر ڈرائیور حضرات کا شعبہ کسی طور پر بھی سرسری نہیں ہوتا۔ ذیلی ادارہ لاہور میں آدھے سے زیادہ کام سائٹس پر ہوتا ہے جہاں ٹرانسپورٹ لازم وملزوم ہے اور پھر اس میں ٹرانسپورٹ پول کا مکمل ہونا اور فعال ہونا بہت ضروری ہے۔ لیکن مجھے شیخ صاحب مرحوم کی بات یاد تھی کہ 'قریشی یاد رکھو گے!' تو ان کی کہی ہوئی ساری باتیں ایک ایک کر کے وقوع پذیر ہوتی رہیں اور میں واقعی ان کو یاد کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔ اسی دوران برادر ملک سے آفیسرز اور سٹاف ٹریننگ کے بارے میں جو یادداشتی دستخط ہوتے تھے، ان کے متعلقہ اجلاس ہر سال منعقد ہو رہے تھے۔ ان اجلاسوں کی ذمہ داری کسی حد تک تو تھی ہی لیکن سٹیج سیکریٹری والی ذمہ داری کافی اہم تھی۔ ایک وقت تھا کہ انتہائی شرمیلی طبیعت ہونے کی وجہ سے اسی ہال میں مجھے سوال کرنے کی جرأت نہیں تھی

اور اللہ کے فضل سے اب یہ وقت تھا کہ مسلسل کئی پروگرامز میں بڑی بے باکی سے سٹیج پر سیکریٹری کے فرائض سرانجام دیتا جارہا تھا۔ ایک دن اس بے باکی کو دیکھ کر اظہر صاحب نے کہا کہ 'قریشی یہ تیری ساری جھجھک کو الٹی ایشورنس کی وجہ سے ختم ہوئی ہے۔ نہ تو کبھی ایشورنس میں کام کرتا نہ لیکچر دیتا اور نہ ہی اتنا بے باک مقرر بنتا۔' حالانکہ اظہر صاحب انتہائی مہارت سے سٹیج پر بے باک گفتگو کرتے تھے اور زیادہ تر فی البدیہہ کرتے تھے۔

افسر برائے منصوبہ بندی کے ایّام میں اگر طارق صاحب کا ذکر نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ طارق صاحب قریشی صاحب کے بعد اور بعد ازاں میاں صاحب کے بعد اس اعلیٰ عہدے پر براجمان ہوئے۔ ان تینوں صاحبان نے ذیلی ادارہ لاہور اور اس سے منسلک فیلڈ کیمپس کے غریبانہ حالات کو نا صرف محسوس کیا بلکہ اس کی اَپ گریڈیشن کو مزید بڑھوتی دی لیکن طارق صاحب کی شخصیت نے تو ہر طرف چار چاند لگا دیے۔ خاص طور پر ٹولز کی بات کی جائے تو مکینیکل، کیمیکل، الیکٹرونکس، جیو فزکس غرضیکہ ہر ڈسپلن کے لیے جدید اور وافر ٹولز مہیا کیے۔ یہی نہیں بلکہ افسران اور سٹاف ممبران کی فزیکل ٹریننگ میں بھی طارق صاحب کی کاوشیں نظر آتی تھیں۔ ان معاملات کے علاوہ طارق صاحب کی بڑی خوبیوں میں ان کا عقیدہ اللہ پر ایمان، مذہب کے ساتھ گہری وابستگی اور اپنے ماتحت عملہ کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا ہے۔ طارق صاحب جب نمائندہ ہیڈ کوارٹر تھے تو اسی دوران ملکی اور غیر ملکی آن جاب ٹریننگ، ہائر ایجوکیشن اور مختلف تکنیکی وفود کی آمد بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ اس لیے طارق صاحب تقریباً ہر ماہ ذیلی ادارہ لاہور میں تشریف

لاتے تھے۔ میں بحیثیت مینیجر ایکسپلوریشن اور بعد ازاں افسر برائے منصوبہ بندی کئی معاملات میں آپ کے نمایندے کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہا تھا، اس لیے میرا تعلق طارق صاحب کے ساتھ کسی حد تک زیادہ تھا۔ طارق صاحب مزاج کے کافی کھُلے ڈُھلے تھے۔ بہت اچھا حسِ مزاح رکھتے تھے اور ساتھ ساتھ اچھا مشورہ، چاہے دینے والا کتنا ہی جونیئر ہو، مان لیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ لاہور میں آئے ہوئے تھے اور غیر ملکی وفد جو چھ افراد پر مشتمل تھا جس نے لاہور آفس آنا تھا۔ ان کی آمد کے موقع پر سب افسران اعلیٰ، ڈپٹی افسران اعلیٰ، ااور دوسرے مہمان اٹھے اور باہر وفد کے استقبال کے لیے چلے گئے۔ اسی دوران باقی صاحبان بھی ایک ایک کر کے اٹھے اور ان کی تقلید میں باہر جا کر وفد کا استعمال کرنے کے لیے قطار میں اکٹھے ہو گئے۔ آخر میں ڈپٹی افسر اعلیٰ، طارق صاحب اور میں رہ گئے تو طارق صاحب اٹھے کہ میں بھی باہر جاؤں اور ان کا استقبال کروں۔ ابھی آدھے ہی اٹھے تھے کہ میں سمجھ گیا۔ فوراً اشارے سے اور بول کر پوچھا، سر آپ کہاں جارہے ہیں، یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ آپ ادھر ہی تشریف رکھیں۔ یہ سب لوگ مع وفد کے ادھر ہی آئیں گے اور آپ کو پروٹوکول دیں گے۔' یہ سننا تھا کہ طارق صاحب فوراًواپس صوفہ پر بیٹھ گئے اور بولے، 'ہاں ٹھیک ہے۔'

اسی طرح ایک موقع پر مرکزی ہال میں مذاکرہ چل رہا تھا کہ کام کی رفتار اور اِس کا معیار کیسے بڑھایا جائے۔ ہال مقامی اور مہمان افسران سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مختلف تجاویز پیش اور نوٹ کی جارہی تھیں۔ اسی اثناء میں جناب جونئیر بٹ صاحب جو اس وقت ہیڈ سروے تھے، اجازت لے کر اٹھے اور بغیر کسی تمہید کے بولے: ”سر

آپ مشینوں کی تعداد بڑھاتے جائیں، ہم گوہر مقصود کے ذخائر کی تعداد بڑھاتے جائیں گے۔" اس برجستہ جملے نے جہاں پورے ہال کو گرما دیا، وہاں طارق صاحب بھی بہت محظوظ ہوئے اور انتہائی خندہ پیشانی سے اس تجویز کو سُنا۔

طارق صاحب کی ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی وہ اللہ کی ذات پر بہت مضبوط ایمان اور نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے ساتھ محبت تھی۔ ہمارے ایک اور صاحب جن کا پہلے بھی ذکر ہوا ہے، جناب عارف صاحب نے ڈی جی خان میں ایک مسجد بنائی ہوئی ہے، جس کے مالی انتظامات زیادہ تر عطیات پر منحصر ہیں۔ بقول نعیم صاحب کے، طارق صاحب جب بھی ڈی جی خان دورہ کے لیے گئے، انھوں نے اس مسجد میں آدھ ایک نماز ضرور پڑھی اور وہاں کے امام اور طالب علموں کو خوب سراہا۔ نیز انھوں نے میرے ہاتھوں کئی دفعہ زکوٰۃ اور مسجد کے لیے عطیات بھجوائے۔ بذلہ سنجی میں بہت مقام رکھتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے چٹکلے اور مذاق اکثر کرتے رہتے۔

افسر برائے منصوبہ بندی کے ایّام تسبیح کے دانوں کی طرح اپنی میعاد پوری کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ۲۰۱۸ء گزر گیا، اور ۲۰۱۹ء آ گیا۔ یہ سال چونکہ میری ریٹائرمنٹ کا تھا، اس لیے یار دوست اکثر پوچھتے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا پروگرام ہے، کوئی اور کام سوچا ہے یا گھر بیٹھنا ہے؟ ناں، گھر نہ بیٹھنا، ورنہ بیمار ہو جاؤ گے۔۔۔! وغیرہ وغیرہ۔ میں تنگ کر جواب دیتا، یار ابھی تو پورا سال باقی ہے۔ عرصہ تو مکمل ہونے دو، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

کرتے کرتے مئی ۲۰۱۹ء آ گیا اور غیر ملکی وفد ایک بار پھر ذیلی ادارہ لاہور میں

تھا۔ مرکزی ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ سب ڈائیلاگ اور مختلف موضوعات کی پیشکش چل رہی تھی اور میں حسبِ معمول سٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ پیشکش کے دوران میں ایسے ہی ذہن تھوڑی دیر کے لیے ہٹا اور جتنی بھی کارروائیاں وہاں چل رہی تھیں ان کی طرف گیا، جن میں تقریباً میں حصہ بقدرِ جُثہ فرائض سرانجام دے رہا تھا، تو ملک صاحب کی کہی ہوئی باتیں جو انھوں نے ۲۰۱۴ء میں میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہی تھیں، کہ عباس! ایک وقت آئے گا سارے دفتر کی کارروائیاں تقریباً تیرے ہاتھ میں ہوں گی اور اللہ تعالیٰ تجھے بہت عزت سے نوازے گا۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ افسر اعلیٰ اور ڈپٹی افسر اعلیٰ، ممبر اور کئی دوسری اہم شخصیات کا دل میرے لیے نرم کر دیا اور تقریباً سارے ہی معاملات انھوں نے میرے حوالے کر دیے۔ ملک صاحب کو اللہ خوش رکھے، بے حد دُوراندیش رہے ہیں اور ان کی کہی ہوئی باتیں جو خاص طور پر مستقبل کی پیش بندی کے طور پر تھیں، درست ثابت ہوئیں۔

ویسے یہاں بھی اظہر صاحب کے فہم و فراست کی داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ جب ہم لوگ مشرقی پوٹھوہار پر کام کر رہے تھے تو مجھے بتایا تھا کہ مقامی لوگوں کے بارے میں اگر تذبذب کا شکار ہونے لگو تو ملک صاحب سے مشورہ کر لینا۔ وہ نہ صرف ان کی نفسیات کو سمجھنے میں مہارت رکھتے ہیں بلکہ معاملہ فہمی اور مستقبل بینی کے بھی ماہر ہیں۔

بات ہو رہی تھی مرکزی ہال میں ہونے والے مذاکرے کی جس میں ملکی اور غیر ملکی ماہرین اپنی اپنی پیشکش بتا رہے تھے۔ جمعۃ المبارک کا دن اس کانفرنس کا

آخری دن تھا اور اختتامی سیشن کے بعد ایک بڑے ہال میں چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہاں سارے ہی ملکی اور غیر ملکی مہمان بھی تھے کہ طارق صاحب نے مجھے بلایا اور میرے گلے میں اپنا بایاں بازو ڈال کر چائے کی میز سے پرے لے جاتے ہوئے کچھ نصیحت کرتے ہوئے بات کر رہے تھے اور سارا ہال انتہائی حیرانی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

قصہ مختصر کہ معاملات چلتے رہے اور ایک غیر ملکی ٹوور کے سلسلے میں مجھے ہیڈ کوارٹر سے لیٹر آیا۔ اس لیٹر کے مطابق میں نے 11 تا16 نومبر کو وہ ٹوور کرنا تھا جبکہ میری ریٹائرمنٹ کی تاریخ 15 نومبر 2019 تھی۔ میں نے اسی لیٹر کے نیچے خالی جگہ پر اس ٹوور کو اٹینڈ نہ کر سکنے کی وجہ تحریر کر کے جناب فاروق صاحب کی سفارش کی کہ وہ اس ٹوور کو مکمل کر لیں اور اس سلسلے کے لیے ان کو ہی موزوں سمجھیں، یہ مشورہ ہیڈ کوارٹر نے مان لیا۔

جب خوشاب کے ایک پراجیکٹ میں ممبر کے نمایندے کی ذمہ داری ملی تو کوئلے کی کانوں کے دورے کا بھی موقع ملا۔ میں چونکہ اس میں واحد جیالوجسٹ تھا، اس لیے کوئلے کی کوالٹی کو چیک کرنا بھی میری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ اس سلسلہ میں پنجاب، سندھ، خیبر پختون خواہ اور بلوچستان، جہاں جہاں کوئلے کے ذخائر پائے جاتے ہیں، وہاں گئے اور تقریباً ہر جگہ میں بطورِ نمونہ کے کوئلہ اور کوئلے کی کان کا دورہ کیا۔ پنجاب میں مکڑوال کوئلے کی کانوں کی وجہ سے ایک مشہور علاقہ ہے۔ یہاں تقریباً پچیس کلومیٹر سے زیادہ لمبائی میں کوئلے کی بے شمار کانیں ہیں جن میں سے اکثر فعال ہیں۔ انھی فعال کانوں میں سے تقریباً ایک درجن کے قریب کانوں

کے اندر جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ کانیں اب پرائیویٹ سیکٹر کے پاس ہیں اس لیے کان کنی کا معیار کافی پتلا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر کو زیادہ سے زیادہ پیداوار کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ حفاظتی تدابیر کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔ مکڑوال کوئلے کی کانیں کئی دہائیوں سے فعال ہیں اور شروع شروع میں جب بجلی سے چلنے والے چھکڑے نہیں تھے تو مقامی لوگ گدھوں کا استعمال کرتے تھے۔ کانوں کے اندر خالی بیگ والے گدھے جاتے اور کوئلہ بھر بھر کر واپس آتے۔ ان گدھوں کے بارے میں بہت دلچسپ اور حیرت انگیز باتیں علم میں آئیں، بلکہ ان کا مشاہدہ بھی ہوا۔ مثلاً کوئلہ عام طور پر کان کی گہرائی میں پایا جاتا ہے اور اس تک کا فاصلہ کان کے منہ سے لے کر گہرائی تک ایک خاص زاویہ کی ڈھال سے مزیّن ہوتا ہے، اس لیے کان کے اندر خالی جانا تو آسان ہے لیکن واپسی پہ چڑھائی عبور کرتے وزن اٹھا کر آنا کافی مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ لیکن قدرت دیکھیے، کہ جب گدھے خالی تھیلے لے کر کان میں جا رہے ہوتے ہیں تو اسی کان سے کوئلے سے لدے ہوئے گدھے باہر آرہے ہوتے ہیں تو اندر جانے والے گدھے بیٹھ بلکہ لیٹ جاتے ہیں اور باہر آنے والے گدھے ان پر پاؤں رکھ کر گزرتے ہوئے باہر آتے ہیں۔ یہ ایسا قدرت کا نظام ہے کہ عقل تھوڑی دیر کے لیے دنگ رہ جاتی ہے کہ کس طرح جانور ان نامساعد حالات میں ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور راحت پہنچاتے ہیں۔

کوئلے کے سلسلے میں سندھ میں لاکھڑا، بلوچستان میں مَچھ اور خیبر پختون خواہ میں ہنگو کے مقام پر پایا جانے والا کوئلہ بھی دیکھا۔ یہ کام کوئی دو سال تک چلتا رہا اور اللہ نے کافی کامیابیوں سے نوازا۔

باب سوم

انمٹ نقوش چھوڑنے والی شخصیات

شیخ صاحب مرحوم:

شیخ صاحب مرحوم کا ذکر اپنی زندگی سے نکال دوں تو یقیناً یہ جو معاملات ہیں جنھوں نے مجھے تکنیکی طور پر نکھارا، ذہنی طور پر مضبوط کیا جیسے انتظامی امور کی دیکھ بھال، ایمانداری، وقت کی پابندی اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ، یہ سب پھیکے اور بے رنگ وبُو ہو جائیں گے۔

شیخ صاحب مرحوم کے اوصاف ایسے رہے ہیں کہ ہر کوئی صرف تمنا ہی کر سکتا ہے کہ یہ اوصاف اس میں بھی ہوں۔ نہ صرف یہ کہ وہ خود عمدہ لیڈر تھے بلکہ وہ لیڈر بناتے بھی تھے۔ قد کاٹھ کے اتنے لمبے چوڑے تو نہیں تھے لیکن ہیبت اتنی تھی کہ دوسرے شعبہ جات کے سینئر لوگ بغیر اجازت ڈی جی خاں آفس کے احاطہ میں داخل ہوتے وقت سو بار سوچتے تھے۔ جناب شیخ صاحب مرحوم کے بارے میں اندر کے صفحات میں بہت سی قابلِ ذکر باتیں ہیں، اب یہاں آپ کی بیماری اور بیماری کا

جس انداز میں مقابلہ کیا، وہ قارئین کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ شیخ صاحب مرحوم کو کینسر جیسا موذی مرض تو ڈی جی خان میں ہی لاحق ہو گیا تھا لیکن اس کی باقاعدہ تشخیص لاہور میں آ کر ہوئی۔ انھیں یہ مرض کم و بیش پانچ سال تک رہا اور اس دوران اس موذی مرض کا انھوں نے جس حیران کن حد تک بہادری سے مقابلہ کیا، اس کا علیٰحدہ سے ایک باب لکھا جا سکتا ہے۔ ابھی اس بیماری کا علاج بشمول کیمو تھیراپی ہو رہا تھا کہ بیچ میں ان کے پلاٹ کے کاغذات کی گم شدگی کا مسئلہ آ گیا۔ ساری زندگی کی جمع پونجی اس پلاٹ پر لگ گئی تھی اور جیسا کہ ہمارے ہاں پراپرٹی سے متعلق مسائل ہیں، وہ تو اچھے بھلے صحت مند انسان کو بیمار کر دیتے ہیں۔ اور جو بندہ پہلے ہی سے ایک موذی مرض کا شکار ہو، اس کا کیا حال ہوتا ہو گا۔ بہرحال شکر الحمد للہ کہ ایل ڈی اے میں ایک دوست واقف مل گیا اور اس کی کاوشوں سے یہ مسئلہ حل ہوا۔ شیخ صاحب مرحوم کی کیمو تھیراپی ایک بالکل نئی دوائی سے ہو رہی تھی جس کی تکلیف بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن کیا مجال کہ شیخ صاحب صاحب آفس سے چھٹی کرتے۔ آپ باقاعدگی سے آفس آتے اور تمام معاملات کو دیکھتے۔

یہ 29 اکتوبر 2003 اور رمضان کی دوسری تاریخ تھی جب ڈاکٹروں نے کہا کہ فوراً خون کا بندوبست کیا جائے۔ میں اور شبیر شاہ اور شبیر اکاؤنٹنس اٹینڈنٹ جلدی سے شیخ زید ہسپتال گئے۔ وہاں شیخ صاحب مرحوم ایمر جنسی میں ایک بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے اور بھابھی ذرا فاصلے پر بہادری سے لیکن آنکھوں میں آنسو لیے مسلسل اپنے جیون ساتھی کو دیکھے جا رہی تھیں۔ میں ان کے پاس گیا اور سلام کیا۔ شیخ

صاحب کا حال پوچھا تو آنکھ سے ان کی طرف اشارہ کیا۔ شیخ صاحب بائیں کروٹ لیے ہوئے تھے۔ بایاں بازو سر کے نیچے تھا اور چہرہ سوجن کی وجہ سے پھولا ہوا تھا۔ میں پاس گیا، ہلکی سی آواز میں السلام علیکم کہا۔ فوراً جواب دیا، وعلیکم السلام' اور پوچھا کہ تمھاری والدہ کا کیا حال ہے؟ (والدہ صاحبہ بھی انھی دنوں اتفاق ہسپتال میں زیرِ علاج تھیں۔) میں نے کہا، ماشاء اللہ سے اب ٹھیک ہیں۔ اسی اثناء میں شیخ صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگا۔ بھابھی کے پاس ایک برتن میں پانی تھا اور اس برتن کی نوزل بنی ہوئی تھی، جو غالباً اسی مقصد کے لیے تھا۔ چنانچہ میں نے وہ برتن لیا اور شیخ صاحب نے ہلکا سا منہ کھولا اور میں نے ان کو پانی پلایا۔ پانی پلانے کے بعد میں نے ٹشو سے ان کا چہرہ صاف کیا اور سامنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد شیخ صاحب کی موندی ہوئی آنکھوں سے پانی نکلنا شروع ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے یہ آنسو ہیں۔ اسی دوران میں خون کا بندوبست کرنے شبیر شاہ کے ساتھ بلڈ بنک آ گیا اور شیخ صاحب کو ایمرجنسی لے جایا گیا۔ تقریباً دو پہر کے دو بجے تھے جب اطلاع ملی کہ شیخ صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون) یہ خبر میرے لیے نہ صرف ایک ناقابلِ یقین بات تھی بلکہ ایک شدید جھٹکا بھی تھا۔ پچھلے سولہ سترہ سال سے ان کی رفاقت کی ایک ایک جھلک آنکھوں کے سامنے آتی رہی۔

جناب شیخ صاحب مرحوم نے ایک شیر جیسی زندگی گزاری۔ اس میں کوئی شک نہیں ڈی جی خان میں کئی لوگ ان کے ساتھ مختلف معاملات میں مخاصمت رکھتے تھے، لیکن وہ بھی شیخ صاحب کی ایمان داری کے دلدادہ تھے اور تعریف بھی کرتے تھے۔

سحری سے کچھ دیر پہلے جسدِ خاکی ہسپتال سے گھر لایا گیا۔ اس دوران جتنے مہمان تھے، ان سب کے لیے عبد القادر صاحب اور سینئر بٹ صاحب مرحوم نے سحری کے کھانے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ سحری تناول کرنے کے بعد نمازِ جنازہ کے وقت کا تعین کیا گیا اور صبح ایک جمِ غفیر تھا جو شیخ صاحب صاحب مرحوم کے جنازے میں شامل تھا۔ڈی جی خان سے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد آئی ہوئی تھی۔ شیخ صاحب مرحوم کا جنازہ پڑھا گیا اور قبرستان تک جسدِ خاکی لے جانے کے لیے ایک بڑی سنگل کیبن گاڑی کا بندوبست کیا گیا۔ مجھے یہ سعادت ملی کے گھر سے قبرستان تک آپ کی چارپائی کے ساتھ ساتھ رہا۔ سارے راستے میں شیخ صاحب مرحوم کا چہرہ دیکھتا رہا۔ بالکل بھی سختی کے آثار نہیں تھے۔ اس طرح لگ رہا تھا کہ شیخ صاحب مرحوم چین کی نیند سو رہے ہیں۔ چہرہ سفید' پیلا نما تھا۔ قبرستان کے نزدیک شیخ صاحب کا چہرہ کفن سے ڈھانپ دیا، کلمۂ شہادت کی گونج میں گاڑی سے نیچے اتارا گیا اور لحد میں اتارنے کے لیے تیاری ہونے لگی۔ چند لمحوں میں شیخ صاحب مرحوم کو منوں مٹی تلے قیامت تک کے لیے سنبھال دیا گیا اور یوں ایک اور آسمان کو زمین نے اپنے اندر سمو لیا۔

سینئر بٹ صاحب مرحوم:

سینئر بٹ صاحب سے سب سے پہلے میرا تعارف 1990 میں ذیلی ادارہ لاہور میں ہوا تھا اور تعارف کروانے والے تھے جناب سید صاحب۔ ذیلی ادارہ لاہور میں

ایک بین الاقوامی وفد کوئی معلوماتی لیکچر کے سلسلے میں موجود تھا۔ وہاں جناب سید صاحب نے میرا تعارف سینئر بٹ صاحب سے کروایا تو سینئر بٹ صاحب، جو کہ بہترین تراش خراش والے لباس میں ملبوس تھے، گوراچٹارنگ اور متناسب جسامت، سر پر کاؤبوائے ہیٹ اور جب سید صاحب نے کہا یہ ہمارے افسر اعلیٰ پشاور جناب سینئر بٹ صاحب ہیں تو بٹ صاحب نے باقاعدہ کورنش بجالانے کے انداز میں اپنا ہیٹ دائیں ہاتھ سے پکڑا، ہلکاسا جھکے اور کیپ کو تھوڑاسا کھسکانے کے بعد دوبارہ پہن لیا۔ سینئر بٹ صاحب کا یہ انداز میرے جیسے بہت بونے قد کے آدمی کے لیے ایک بڑااعزاز تھااور ساتھ ہی سینئر بٹ صاحب کی عزت ووقار اور طنطنا میرے دل میں گھر کر گیا۔ شیخ صاحب مرحوم بھی بٹ صاحب کا ذکرِ خیر اکثر کیا کرتے تھے۔ لیکن آج جب بٹ صاحب ملے تو احساس ہوا کہ کیوں ایک ہیر و نما آدمی لوگوں میں نقارۂ خدا کی طرح ہوتا ہے۔

فتح جنگ کیمپ میں رہتے ہوئے ہم نے تین مقامات پر کھدائی کی اور تقریباً نوّے کے قریب سوراخ کیے۔ چونکہ گوہر مقصود کے زمینی اثار بہت متاثر کن تھے اور ہر لحاظ سے پُر امید بھی لیکن اللہ تعالیٰ کا اپنا نظام ہے۔ محنت کرنا انسان کا فرض ہے پھل عطا کرنا اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی پر منحصر۔ چنانچہ چند ایک سوراخوں میں کچھ کچھ نشانیاں ضرور ظاہر ہوئیں لیکن جو ایک مربوط قسم کا ڈیپازٹ ہوتا ہے، وہ نہیں بن سکا۔ میں اس ناکامی کو اپنی ناکامی سمجھ رہا تھااور کافی دنوں سے بجھا بجھا سا تھا۔ انھی دنوں جناب سینئر بٹ صاحب افسر اعلیٰ لاہور تشریف لائے اور انھوں نے تمام

سائٹس کا دورہ کیا۔ میری پژمُردہ طبیعت ان سے چھپی نہ رہ سکی تو پوچھا، کیا بات ہے؟ تم تازہ دم نہیں لگ رہے۔ میں نے جواب دیا کہ سر اتنی تگڑی نشانی فیل ہو گئی ہے، اس لیے اس کا اثر ہے۔ فوراً بولے، لو، تمھاری تو ایک نشانی فیل ہوئی ہے اور تم نڈھال ہو گئے ہو۔ میری طرف دیکھو، میری ساٹھ سے زیادہ نشانیاں فیل ہوئیں لیکن میں پھر بھی تازہ دم ہوں اور ابھی بھی ہمت نہیں ہار رہا۔ ایسی کوئی بات نہیں، محنت کرتے رہو۔ یہاں کامیابی نہیں ملی تو کہیں اور کامیابی مل جائے گی۔ اس طرح سینئر بٹ صاحب نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میری طبیعت میں کافی بہتری آگئی۔

کیمپ میں آکر سینئر بٹ صاحب کو کیمپ میں تیار کردہ چکن بروسٹ لنچ میں پیش کیا اور ساتھ کوفتے بھی۔ کھانا مزیدار تھا، خاص طور پر چکن بروسٹ۔ مجھ سے پوچھنے لگے، ' یہ بروسٹ بہت مزیدار اور خستہ ہے، کہاں سے منگوایا ہے؟' میں نے کہا، سر یہ دہی میں بنتا ہے اور گھی اور ککنگ آئل کے بغیر، آئل کا بس اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ باقی یہ سارا دہی اور گوشت کے پانی سے بنتا ہے۔' خیر کھا کر بہت خوش ہوئے۔ پھر جو بھی سینئر افسر جیسے راشد صاحب یا خالد صاحب کیمپ سے ہو کر آتے، ان سے یہ بات ضرور پوچھتے کہ قریشی نے تمھیں پانی والا بروسٹ کھلایا کہ نہیں؟

بعد میں کبھی کبھی مجھے چھیڑنے والے انداز میں کہتے، قریشی، تمھارے فتح جنگ کیمپ نے ہمیں بہت ملال کیا۔

سینئر بٹ صاحب اوصاف کا مجموعہ تھے۔ بہترین اندازِ گفتگو، بہترین پوشاک پہننے کے عادی، علم کا بے بہا سرچشمہ، جب علمی گفتگو کرتے تو مجمع کو جیسے چُپ لگ

جاتی۔ بس دل کرتا کہ سینئر بٹ صاحب بولتے رہیں اور علم کے خزانے لُٹاتے رہیں اور ہم سُنتے رہیں۔ ڈھارس بندھانے، تھپکی دینے، قدر دانی میں آپ سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ہو۔ جوہر شناسی میں بھی آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ایک بین الاقوامی سائنس دان تو تھے ہی لیکن ساتھ ساتھ عمدہ اخلاق کے مالک بھی۔ ایک دفعہ ہمارے ایک سینئر سائنس دان کے بارے میں کوئی غلط خبر پھیلی۔ درمیان میں مزے لینے والے بھی ہوتے ہیں لیکن جب آپ کو اس خبر کی خبر ملی تو باوجود اس کے کہ ان صاحب کے ساتھ سینئر بٹ صاحب کے تعلقات واجبی سے تھے لیکن سینئر بٹ صاحب نے بہترین الفاظ میں نہ صرف ان کی تعریف کی بلکہ ان کا اس معاملے میں برأت کا اظہار بھی کیا۔

ریٹائرمنٹ تک کام کرنے سے باز نہ آئے اور کاکول میں کسی پرائیویٹ فاسفیٹ مائن اونر کے ساتھ کنسلٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہیں پر ایک کان کے بیٹھ جانے پر ایک عظیم الشان انسان ہم سے چھِن گیا۔ یہ سانحہ 30 جون 2011 کا ہے۔ نمازِ جنازہ میں جناب محمد نعیم صاحب جو اس وقت ایک بڑے عہدے پر تعینات تھے نے، ایک بڑی دل پذیر بات سینئر بٹ صاحب کے متعلق کی۔ انھوں نے فرمایا، 'ایک عظیم علم دوست آج ہم سے بچھڑ گیا۔'

خان صاحب:

یوں تو میری تمام سروس کے دوران اگر آپ نے غور کیا ہو تو ہر قدم پر خان

صاحب کا نامِ گرامی موجود ہے۔ خان صاحب کی جو خاصیتیں ہیں، وہ تو وقتاً فوقتاً اس پوری کتاب میں مذکور ہیں لیکن چونکہ ساتھ اتنا زیادہ مضبوط اور ہر دم تھا کہ ایک پورا باب بھی اسے بیان کرنے کے لیے کم ہے۔ وہ ایک بہترین دوست، کامل استاد، اعلیٰ روحانی شخصیت، صوم و صلوٰۃ کے پابند اور منفرد مہمان نواز انسان تھے۔ مہمان نوازی کا ذکر تو خان صاحب کی ذات کے ساتھ اس طرح پیوستہ ہے کہ جو شخص بھی ایک دفعہ خان صاحب سے مل لیتا ہے، انھی کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ میں جب شروع شروع میں ڈی جی خان فیلڈ کیمپ گیا تو وہاں پہ خان صاحب چونکہ چھٹی پہ تھے، اس لیے ان کے ٹینٹ میں کچھ دن رہنے کا موقع ملا اور ساتھ ہی آفیسرز میس میں کچھ دنوں کا کھانا بھی کھایا۔ جب خان صاحب چھٹی سے واپس آئے اور میرے ساتھ ملاقات ہوئی، تو یقین جانیے اس ملاقات میں قطعاً کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ہم پہلی پہلی دفعہ مل رہے ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ شاید بچپن سے ہی اکٹھے ہیں۔ خان صاحب کی دریا دلی کا اندازہ اس معمولی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میں نے جو چند دن آفیسرز میس میں گزارے تھے اور اس کے کھانے کا جو خرچہ تھا، خان صاحب بضد تھے کہ یہ خرچہ وہ اپنی جیب سے ادا کریں گے۔ میں حیران رہ گیا کہ زندگی میں پہلی دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا ہے اور نہ جان نہ پہچان، لیکن خان صاحب جس مہمان نوازی اور بے لوث رویے کا اظہار کر رہے ہیں، بہت کم کم لوگوں میں یہ خواص ہوتے ہیں۔ یقین کیجیے میں تو اس دن سے ہی خان صاحب کا مرید ہو گیا۔

بعد ازاں کام کے دوران ان کا ساتھ نصیب ہوا تو میں مزید حیران ہوا کہ میری

جائننگ سے فقط ڈیڑھ دو سال پہلے ان کی جائننگ تھی، لیکن وہ ہر تکنیک کے نہ صرف ماہر تھے بلکہ استادوں سے بڑھ کر سمجھاتے تھے۔ یہی خداداد صلاحیت تھی جو خان صاحب کو پہلے پراجیکٹ مینیجر، پھر افسر اعلیٰ مائننگ اور پھر افسر اعلیٰ ایکسپلوریشن کے مدارج طے کرواتی رہی۔ شاید ہی کوئی ایسا ڈیپارٹمنٹ یا عمل ہو جس کی سوجھ بوجھ خان صاحب کو نہ ہو۔ یہاں پہ میں تفصیلات کا ذکر کرنا ضروری خیال نہیں کرتا لیکن یہ ضرور ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے خان صاحب کو وہ وہ علم عطا فرمایا ہے جس کا دوسرے لوگ سوچ ہی سکتے ہیں۔

بھائی جان:

نہایت ہمدرد و مخلص انسان، جو حقوق العباد ادا کرنے کی دولت سے مالا مال، جہاں جہاں پریشانی، دکھ، مالی مشکلات مخلوقِ خدا کو درپیش ہوں، وہیں پر آپ کو یہ مردِ مجاہد نظر آئے گا۔ انھوں نے بھی میری طرح ڈیلی ویجز حیثیت سے کام شروع کیا تھا اور اللہ کی نوازش سے چیف سائنٹسٹ کے عہدے تک پہنچے۔

لوگوں کے ساتھ دکھ سکھ میں کام آتے ہوئے کئی دفعہ اپنی نوکری کو بھی داؤ پر لگایا۔ سینئر افسران کی دھمکیوں، جھڑکیوں اور خطرناک نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ضرورت مندوں کے لیے شجرِ سایہ دار بنتے رہے۔

ایک دفعہ ایک انڈوانس کی ایڈجسٹمنٹ کئی ماہ تک نہ ہوئی۔ وہ انڈوانس جناب بھائی جان نے لیا تھا اور شیخ صاحب مرحوم کافی دنوں سے زبانی بات کرتے رہے۔ بعد

ازاں ایک دو لیٹر بھی دیے لیکن بات بغیر کسی نتیجہ کے رہی۔

میں ان دنوں پروکیورمنٹ کے معاملات بھی ڈیل کر رہا تھا۔ مجھے شیخ صاحب مرحوم نے بلایا اور سختی کے ساتھ کہا کہ بھائی جان کو کہو کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ایڈ جسٹمنٹ دیں ورنہ ان کی ماہانہ تنخواہ میں سے پیسے کاٹنے پڑیں گے۔ چنانچہ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے مصداق، میں نے دفتری زبان میں بھائی جان سے تقاضا کیا کہ جیسا صاحب کہہ رہے ہیں، مہربانی کر کے ویسا ہی کر دیں۔ تو حسبِ عادت کہتے ہیں، ہو جائے گا، ہو جائے گا! فکر نہ کرو وغیرہ۔ اسی طرح دو تین دن گزر گئے اور میرے تقاضے میں شدت آنا شروع ہو گئی۔ اب اصل حقیقت نہ بتائیں کہ ماجرا کیا ہے اور نہ ہی ایڈ جسٹمنٹ جمع کروائیں۔ اس دوران میں ایک دن میں بھائی جان صاحب کے گھر گیا تو وہاں ایک ڈرائیور کو دیکھا جو اپنا دُکھڑا سنا رہا تھا۔ ساتھ ہی نرمی کا بھی کہہ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں مجھے سمجھ آگئی جو یوں تھی کہ اس ڈرائیور کے گھر میں کوئی بچی بچہ ہونے والا تھا اور اس کے لیے کچھ رقم درکار تھی۔ بھائی جان نے اپنی جیب میں سے اسے اچھی خاصی رقم دی اور ساتھ وہ معمولی سی رقم بھی دے دی جو بعد میں وجہِ تنازع بنی۔ جب مجھے اصل صورتِ حال کا اندازہ ہوا تو میں کافی شرمندہ ہوا اور بھائی سے کہا کہ یہ بات آپ مجھے پہلے بتا دیتے تو میں خود سے بندوبست کر دیتا۔ تو کہنے لگے، کوئی بات نہیں، بس اگر تمھیں حقیقت کا پتا چل گیا ہے تو کسی سے ذکر نہ کرنا۔ بہر حال کچھ دنوں کے بعد وہ ایڈوانس کی رقم بھائی جان نے جمع کروا دی۔

اسی طرح آصف ایک ٹیکنیشن تھا اور بے حد محنتی لڑکا تھا۔ یہ ان دنوں کی

بات ہے (غالباً 2006) جب میں ڈی.جی خان سے لاہور ٹرانسفر ہو چکا تھا۔ بھائی جان صاحب نے مجھے فون کیا اور کہا کہ 'میں آصف کو بھیج رہا ہوں۔ ایک تو اس کا بخار ختم نہیں ہوتا اور بلڈ پریشر بھی قابو میں نہیں آتا، اس کو زبردستی ہسپتال لے جاؤ اور اس کا چیک اَپ کرواؤ۔' چنانچہ میں آصف کو شیخ زید ہسپتال لے کر گیا۔ آصف سارے راستے ہنستا رہا اور یہی کہتا رہا کہ 'میں تو ٹھیک ہوں، بھائی جان مجھے زبردستی ہسپتال میں داخل کروانا چاہتے ہیں۔' اسی اثنا میں ہم لوگ شیخ زید ہسپتال لاہور کے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچ گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے جب آصف کا معائنہ کیا تو پتا چلا کہ آصف کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے ہیں اور اس کا بچنا مشکل ہے۔ وہی ہوا، چھ یا سات دن بعد آصف کا انتقال ہو گیا۔

بھائی جان کی دلیری کا یہ عالم رہا کہ ایک دفعہ ایک سائیٹ میں چہل قدمی کے دوران ایک سانپ نے پاؤں پر کاٹ لیا۔ سانپ نے کاٹ تو لیا لیکن اب بھاگ کر جائے کہاں، بھائی جان نے اس وقت قینچی چپل پہنے ہوئے تھے۔ اسی چپل کو اُتار کر سانپ کا تعاقب کیا اور اس کو مارنا شروع کر دیا۔ آخر وہ سانپ مار کر ہی دم لیا۔ پھر وہاں سے گاڑی لے کر ڈی جی خان ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوری طور پر انجکشن لگایا اور ضروری طبّی امداد پہنچائی۔ دورانِ علاج ڈاکٹر صاحب کسی اور مریض کی طرف متوجہ ہوئے تو بھائی جان نے ساتھیوں سے کہا کہ یار مجھے زبردست بھوک لگی ہوئی ہے، میں ذرا کھانا کھا آؤں، حالانکہ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ اس دوران نہ تو سونا ہے اور نہ کچھ کھانا ہے۔ بڑی مشکل سے بھائی جان کو روکا گیا۔

ایک دفعہ مقامی لوگوں نے کسی بات پر ناراض ہو کر ہمارے ایک افسر کو اپنے گاؤں میں زبردستی روک لیا ار ایک قسم کا حبسِ بے جا میں رکھ لیا۔ کافی دیر تک یہ صاحب جب کیمپ نہ آئے تو بھائی جان کو جستجو ہوئی کہ وہ صاحب ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے۔ چنانچہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے سائٹ پر گئے اور حالات سے آگاہی ہوئی۔ لہٰذا مقامی سردار کو ملے اور اسے کہا کہ میرے افسر کو چھوڑ دو اور مجھے رکھ لو۔ بس ایک کام کرنا، کہ صبح وشام کا کھانا دیتے رہنا اور وقتاً فوقتاً چائے پلاتے رہنا۔ وہ مقامی سردار کچھ شرمندہ ہوا اور بھائی جان کو چائے پانی پلانا کر مع اس افسر کے رخصت کیا۔

بھائی جان چائے کے بے حد شوقین تھے، خود بھی چائے بنانے کے ماہر تھے۔ فیلڈ ورک کے دوران آپ کے فیلڈ بیگ میں جہاں اور دوسری فیلڈ کے متعلق چیزیں ہوتی تھیں، وہاں چائے کا بھی مکمل سامان کیتلی سمیت موجود رہتا تھا۔ جہاں دل آیا، وہیں جھاڑیوں کو جلایا اور چائے تیار۔ خود بھی نوشِ جاں فرماتے اور ساتھیوں کو بھی پیش کرتے۔

سب خوبیوں میں ممتاز خوبی بھائی جان کا پاپولر ہونا یعنی ایک جانی پہچانی شخصیت کا ہونا تھا۔ کیا مائننگ، کیا ایکسپلوریشن، کیا سول ورکس، ہر ایک شعبے میں معتبر اور ایک جانا مانا نام تھا۔ ہر شعبے کا بندہ بھائی جان سے واقفیت رکھتا تھا اور اکثر اوقات اس واقفیت کے بل بوتے پر اپنا کام بھی نکلوا لیتا تھا۔

اس طرح کی بیسیوں مثالیں بھائی جان کے ساتھ منسلک ہیں۔ ہر وقت چہرے پر

ایک خاص قسم کی طمانیت اور مسکراہٹ قائم رکھنا اور کبھی بھی کسی ٹینشن کا شکار نہ ہونا بڑے بڑے مسئلہ کا مقابلہ کرنا اور خوش رہنا۔ یہ بھائی جان کا طرّۂ امتیاز رہا ہے۔ بھائی جان غالباً 2016 میں بحیثیت پراجیکٹ مینیجر انچارج ڈی جی خان ریٹائر ہوئے۔

عبدالقادر صاحب:

موصوف ایک منجھے ہوئے اور بہترین جیالوجسٹ ہیں۔ گوہرِ مقصود کی 'الف' سے لے کر 'ے' تک جو بھی عوامل اور ان کا سلسلہ چلتا ہے، سب سے بخوبی واقف تھے۔ شروع شروع میں بلکہ جب میں ابھی ڈی جی خان میں ہی تھا، تو عبدالقادر صاحب کا غائبانہ تعارف جناب شیخ صاحب مرحوم کی زبانی ہوتا تھا اور بارہا ہوتا رہا لیکن اس تعارف میں عبدالقادر صاحب کی شخصیت کا سخت گیر چہرہ نمایاں رہا جس کی وجہ سے میں کچھ کچھ اپنے آپ کو کھنچا سا محسوس کرتا رہا۔ پھر انھی ایّام میں عبدالقادر صاحب جب ڈی جی خان بھی آتے رہے اور میں ڈرا سہما سامنے آنے سے بھی گھبراتا تھا۔ عبدالقادر صاحب کا چہرہ پُر اعتماد اور گفتگو اپنے مضمون میں واضح، پُر تاثیر اور مثالی تھی۔ لیکن جب لاہور میں ٹرانسفر ہو کر آیا اور چونکہ یہاں عبدالقادر صاحب کا طوطی بولتا تھا، تو اپنے آپ کو تکنیکی طور پر مضبوط کرنے کے لیے زیادہ وقت پُرانی رپورٹوں کو پڑھنے میں اور اپنی نئی نئی رپورٹس کو لکھنے میں مصروف رکھتا تھا۔ ایک دفعہ عبدالقادر صاحب ہمارے سروے آفس آئے اور جناب اظہر صاحب، افضال پیرزادہ صاحب، ملک صاحب سب سے ملے اور کافی دیر گفت و شنید کرتے رہے۔

ان کی گفتگو کے دوران میں سر نیچے کیے اپنی رپورٹ لکھتا رہا اور ان کی گفتگو کا حصہ نہ بنا تو کچھ دیر کے بعد بولے، 'اگر بندہ نیک نیّت ہو تو جتنا مرضی کوئی شور و غوغا کرے، اس کے کام میں دخل اندازی نہیں ہو سکتی۔'

پھر آہستہ آہستہ جب عبدالقادر صاحب کی شخصیت کے تمام پہلو کھل کر سامنے آئے تو انتہائی بہترین، مشفّق، حالاتِ حاضرہ سے بخوبی واقف، سپورٹس مین، اپنے ڈیپارٹمنٹ اور اپنے کام سے صحیح مخلص پایا۔

پھر ایک وقت یہ بھی آ گیا کہ میں ان کے زیرِ نگرانی کے۔ پی۔ کے کے ایک بڑے پراجیکٹ کے کیمپ انچارج کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ عبدالقادر صاحب جیسے ہر فن مولا شخص سے سیکھنے کا بہت موقع ملا۔ جب میں انچارج کیمپ تھا تو بارہا غلطیاں سرزد ہو جاتیں اور خاص طور پر ایڈمنسٹریشن کے متعلقہ، لیکن ہر غلطی پر عبدالقادر صاحب کو فون پر بتا دیتا اور وہ انتہائی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے کہ 'کوئی بات نہیں، میں دیکھ لوں گا۔ آئندہ احتیاط کرنا۔'

جب افسرِ اعلیٰ کراچی بن کر جا رہے تھے تو اپنی ذاتی جمع کی ہوئی اشیاء بانٹ رہے تھے۔ میرے حصے میں مولانا مودودی کی لکھی ہوئی قرآن پاک کی تفسیر "تفہیم القرآن" آئی۔ اس تفسیر کا میں آج بھی مطالعہ کرتا ہوں۔

عبدالقادر صاحب جیسا ڈسپلن کا پابند میں نے اپنی زندگی میں بہت ہی کم کوئی اور شخص دیکھا ہو گا۔ وہ روزانہ کی بنیاد پر، ہفتہ وار بنیاد پر اور سالانہ بنیاد پر ٹائم ٹیبل مرتب کرتے تھے اور اس ٹائم ٹیبل پر باقاعدہ عمل درآمد بھی ہوتا تھا۔

نئے آنے والے جیالوجسٹ افسران کی تربیت ہر لحاظ سے عبد القادر صاحب سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ جس نہج پر وہ ان نئے افسران کی تربیت کرتے، وہ عبد القادر صاحب ہی کا خاصہ تھا۔ کے۔ پی۔ کے کے مشہور ڈیپازٹ کا منظرِ عام پر آنا جہاں عزیز صاحب کا کارنامہ ہے، وہیں پر عبد القار صاحب کو اس کا کریڈٹ نہ دینا یقیناً انصاف پر مبنی نہ ہو گا۔ اگر کوئی تکنیکی پوائنٹ سے دیکھے تو کسی بھی جگہ میں موجود گوہرِ مقصود کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور اس کی گتھیاں سلجھانے میں عبد القادر صاحب کی کاشوں کا بہت عمل دخل ہے۔ عبد القادر صاحب یقیناً ایک ہیرو، ایک لیجنڈ رہے ہیں اور ان کا نام بے شک لکڑی کے تختے پر نہ لکھا گیا ہو لیکن جب بھی سنٹر میں کسی بھی تکنیکی یا بغیر تکنیکی عمل کی تاریخ کا ذکر کیا جائے، عبد القادر صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آصف صاحب:

نہایت کامیاب اور فراست سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ سیلف میڈ اتنے کہ خود بتاتے ہیں کہ جب وہ گوجرانوالہ سے لاہور آئے تو صرف ایک عدد چارپائی ہمراہ لے کر آئے اور ادھر اپنی محنت کے بل بوتے پر اور اللہ کے فضل و کرم سے ہر نعمتِ خداوندی اور وافر نعمتِ خداوندی سے سرفراز ہوئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک کامیاب اور فرمانبردار اولاد جیسی نعمت کے مالک ہیں۔

آصف صاحب انتہائی زیرک اور مردم شناس آدمی ہیں۔ ان کے متعلق بڑی

شخصیات کا اندازہ تھا کہ شیخ صاحب کبھی بھی افسر اعلیٰ ایکسپلوریشن نہیں بن سکتے لیکن ان تمام لوگوں کے اندازے نہ صرف غلط ہوئے بلکہ آصف صاحب اب تک آنے والے تمام افسران اعلیٰ سے بڑھ کر ایک کامیاب سائنسدان ثابت ہوئے۔

معاملہ فہمی اور بندہ شناسی کا ہنر پیدائشی ہے۔ میں ایک بار اظہر صاحب کے ساتھ سینئر بٹ صاحب کی گاڑی کا سودا کرنے ان کے دفتر میں جارہا تھا کہ آصف صاحب نے دیکھ لیا اور فوراً اپنے ساتھیوں کو کہا کہ آج بٹ صاحب کی گاڑی بک جائے گی جو کہ کئی ماہ سے باوجود کوششوں کے نہیں بِک سکی تھی۔ یہ بات آصف صاحب نے مجھے خود بتائی اور واقعی اس دن ہم بٹ مرحوم کی گاڑی کی فروخت میں کامیاب ہوئے۔

راشد صاحب:

راشد صاحب اپنی ذات میں یکتا رہے ہیں۔ نہ صرف اپنے کام یعنی مکینیکل کے شعبہ کے ماہر بلکہ دوسری انجینئرنگ سائنس کے راز و نیاز سے واقفیت ان کی شخصیت کو ایک گُرو کی حیثیت دیتی ہے۔ انتہائی ہمدرد، دوسروں کے کام آنے والے، صاف ستھری، ہنسی مذاق والی طبیعت۔ ویسے بھی فیصل آباد سے تعلق کی بنا پر کثیف سے کثیف بات کو انتہائی لطافت کا لباس پہنانے میں استاد۔ تقریباً سارا کیمپ اور ایکسپلوریشن کے افسران اور عملہ راشد صاحب کی شخصیت کا مداح تھا۔ بڑے سے بڑے مسئلے کا حل صرف اور صرف راشد صاحب کے پاس ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ہم

سروے والوں کا کیمپ راشد صاحب کے کیمپ میں کوئی خصوصی ڈرلنگ کر رہا تھا اور راشد صاحب سے وقتاً فوقتاً ملاقات اور مشورے کے لیے ان کے آفس اور میس میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ بڑی مشینوں کی بیٹریاں کم ہو گئیں۔ نئی بیٹریاں وقت پر خریدی نہ جا سکیں تو ایک ہی بیٹری سے ہم ڈوزر بھی سٹارٹ کرتے اور بعد میں اسی بیٹری سے ڈرلنگ رِگ بھی۔ سردیوں کے ایام تھے جب ایک دن ڈوزر کو سٹارٹ کیا اور ڈرلنگ رِگ سٹارٹ کرنے کے لیے اس بیٹری کو ڈوزر سے اُتار کر زمین پر رکھا۔ تھوڑی دیر کے لیے الیکٹریشن کا دھیان ہٹا اور سرور (ڈوزر آپریٹر) نے ڈوزر کو ریورس کیا۔ ساتھ ہی بیٹری جزوی طور پر ڈوزر کی چین کے نیچے آ گئی۔ ڈوزر سٹارٹ ہو گیا لیکن رِگ سٹارٹ نہ ہو سکی چونکہ بیٹری اب ناکارہ ہو چکی تھی۔ الیکٹریشن سمیت ہم سب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے کیونکہ آج ہی جناب شیخ صاحب مرحوم کا کیمپ وزٹ تھا اور انھوں نے سائٹ کا دورہ بھی کرنا تھا۔ شکر خدا کا کہ بیٹری کے اندر والے سیل کسی حد تک بچ گئے اور اس کا اوپر والا کَور ناکارہ ہو گیا۔ اب کیا کرتے؟ بیٹری بھی ایک تھی اور مینیجر ایکسپلوریشن کا دورہ بھی اور ڈرلنگ بھی ناگزیر تھی۔ اس وقت بھائی جان کیمپ انچارج تھے۔ ہمیشہ کی طرح ٹھنڈے ٹھار اور پُرسکون لہجے میں بولے: 'اچھا، چلو راشد صاحب کی ورکشاپ میں چلتے ہیں۔' چنانچہ سب سے پہلے ورکشاپ کے کباڑ خانے میں گئے اور اسی بیٹری کے کَور جیسا دوسرا کَور کھوجنے لگے۔ جب تسلی بخش کَور کھوج لیا گیا تو راشد صاحب کی ورکشاپ میں گئے۔ سلام دعا کے بعد راشد صاحب گویا ہوئے۔ 'کیوں بھئی، آج اتنی صبح صبح ورکشاپ

میں آ گئے ہو، خیر تو ہے؟' بھائی جان نے ساری کہانی اور المیہ بیان کیا تو فوراً بولے، 'سیل تو بچ گئے ہیں نا؟ شاید ہمارے کباڑ خانے میں کوئی پرانی بیٹری ایسی مل جائے جس میں اس کے سیل ڈال کا قابلِ استعمال بنالیا جائے۔' ہم فوراً بولے کہ سر جی بیٹری کا خول ڈھونڈ لائے ہیں۔'

جلدی سے بولے، 'جاؤ میرے الیکٹریشن کو بھی لے جاؤ اور اس پرانے خول کو اچھی طرح صاف کروا کے یہ سیل ڈال دو اور اپنا کام چلاؤ۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ایک ایسا مسئلہ منٹوں میں حل کر دیا جس نے ہمیں ہوش سے بے گانہ کر دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ یاد رہے کہ یہ مسئلہ ویسے بھی حل تو ہو سکتا تھا لیکن اس کے لیے دفتری کارروائیاں اور افسران سے اجازت نامے اور وقت اور پیسوں کا اچھا خاصا عمل دخل ہونا تھا۔ لیکن راشد صاحب کی شفقت اور کمال مہربانی سے یہ مسئلہ فٹافٹ حل ہو گیا اور اسی دن ڈرلنگ رِگ کو سٹارٹ کر کے ڈرلنگ کا کام شروع کر دیا گیا۔

کیمپ میں رات گئے تک بیڈ منٹن کھیلنے کے بعد کچھ سینئر افسران کی بیٹھک لگتی اور حالاتِ حاضرہ پر پُر مغز اور سیر حاصل تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ اس میں بھی راشد منصور صاحب کی مدلل لیکن اختصار کے ساتھ گفتگو سُننے لائق ہوتی تھی۔ ایک دن میں اور جونیئر بٹ صاحب ہائڈرالوجی کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے اور زیرِ زمین واٹر ٹیبل کی موجودگی اور متعلقہ عوامل کے بارے بات چیت ہو رہی تھی۔ راشد صاحب بظاہر لاتعلق بیٹھے نظر آئے اور ہمیں بھی ایسا ہی لگ رہا تھا کہ راشد صاحب کا

ہائڈرالوجی کی باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن جب انھوں نے پوروسٹی، پرمیبلٹی اور ایکوفر جیسی مشکل اصطلاحات کا استعمال کیا تو ہم بہت حیران ہوئے کیونکہ ہمارے خیال میں مکینیکل شعبے کا ایکسپرٹ جیالوجی میں استعمال ہونے والی اصطلاحات سے نابلد ہونا چاہیے تھا، لیکن راشد صاحب نے ہمارا یہ خیال غلط ثابت کیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اِس ادارہ میں شمولیت سے پہلے اپ انڈس ویلی نام کمپنی کا حصہ تھے جو ٹیوب ویل کے لیے بھی ڈرلنگ کرتی تھی۔

راشد صاحب بیڈ منٹن کے بھی ماسٹر تھے، لمبا قد ہونے کی وجہ سے کورٹ میں شٹل کاک تک رسائی بہت آسانی سے کر لیتے تھے اور مکس شاٹس میں مہارت رکھتے تھے۔ اس لیے میں نے ان کو ہارتے ہوئے بھی کم ہی دیکھا ہے۔ رات سونے پہلے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور پڑھتے تھے۔ اس لیے معلومات کے بارے میں خبر دار تھے۔ انھیں کرکٹ کا بھی بہت شوق تھا بلکہ ان کا ایک کلاس فیلو شاید، یونی ورسٹی فیلو تھا حسن جمیل جو کہ فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلا ہوا تھا اور شاید پاکستان الیون کا بھی حصہ بنا ہو، اس کا ایک دن مجھ سے ذکر کیا تو میں حسن جمیل کرکٹر کے بارے میں جو جانتا تھا کہ کس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے کھیلتا رہا ہے۔ لیفٹ آرم میڈیم فاسٹ بالر تھا۔ بال گھنگھریالے، لمبا قد، مضبوط جسم وغیرہ وغیرہ تو بہت حیران ہوئے کہ اتنا کچھ جانتے ہو۔ میں نے کہا، سر جی کرکٹ کھیلتا رہا ہوں اس لیے اس کیمپ میں آ گیا ہوں تو بہت ہنسے اور ہنسی بھی ان کی مخصوص ہے۔ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ ارشد صاحب اور جونیئر بٹ صاحب جب کبھی کبھی ان کی آواز میں بات کرتے تھے۔ اسی

طرح ایک دن ہم لاہور کے لیے بس میں اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ انھی دنوں پاکستان کی کرکٹ ٹیم نیوزی لینڈ کے دورہ پہ تھی اور مخالف ٹیم کو دوسری اننگز میں صرف 108 رنز کا ہدف دیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے، 'عباس کیا خیال ہے، پاکستان ہارے گا یا جیتے گا؟' میں نے اتفاقاً اس ٹیسٹ میچ کی کچھ جھلکیاں دیکھ رکھی تھیں اور وسیم وقار کی بالنگ آخری دن کی خستہ پچ پر ہونا تھی۔ اس لیے میں نے کہہ دیا کہ سر پاکستان یہ میچ جیت جائے گا۔ اور جب پاکستان واقعی جیت گیا تو مجھ سے تکنیکی وجوہات جاننے کے لیے خصوصی ملاقات کی۔

راشد صاحب میرے اور جونیئر بٹ صاحب کے دوستوں میں سے تھے حالانکہ سینیارٹی کے لحاظ سے کافی فرق تھا لیکن ایک تو لاہور میں اکٹھے جاتے تھے اور دوسرا کھُلے ڈھلی طبیعت کی وجہ سے ہنسی مذاق اور لطیفہ بازی چلتی رہتی تھی تو احترام کے ساتھ بے تکلفی بھی موجود تھی۔ تیسرا یہ کہ کھیلوں کے ساتھ لگاؤ بھی مشترکہ وصف تھا۔ ان تمام عوامل کی وجہ سے ہماری طبیعتیں آپس میں بہت ملتی تھیں اور ہم بغیر کسی دباؤ کے رہتے تھے۔

محمد خالق صاحب:

یقین جانیے ذیلی ادارہ لاہور کی تاریخ میں جناب خالق صاحب کا ذکر ایسے ہی ہے جیسے ٹچ بٹن۔ جناب خالق صاحب طبیعت کے انتہائی نفیس، کھُلے ڈُھلے مزاج کے، بے حد محنتی، مخلص اور کامیاب تکنیک کار تھے۔ یہ صاحب بحیثیت مینیجر

ایکسپلوریشن ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے اپنا پورا عرصۂ ملازمت ذیلی ادارہ لاہور میں گزارا۔ خالق صاحب کو ایکسپلوریشن کا ماسٹر بھی سمجھا جاتا ہے کیونکہ شاید ہی پاکستان میں کوئی کیمپ ہو جس کو خالق صاحب کی خدمات سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا ہو۔ خالق صاحب نے اپنی ملازمت کا 90 فیصد دورانیہ فیلڈ میں مختلف کیمپوں میں خدمات دیتے ہوئے گزارا۔ وہ طبیعت کے ایسے تھے کہ شاید ہی کوئی آپ کی صحبت میں بور ہوتا ہو۔ زیادہ تر احباب خوش رہتے اور خالق صاحب کے تجربات سے گوناگوں فائدہ اٹھاتے۔ آپ یاروں کے یار تھے اور انتہائی حسّاس طبیعت کے مالک۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ نسیم مرحوم اور سینئر بٹ صاحب کی شہادتوں کے مواقع پر وہ جس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے، ایسے لگتا تھا جیسے ان کا کوئی بہت ہی نزدیکی یا سگّا رشتے دار فوت ہو گیا ہو۔ میرا خالق صاحب کے ساتھ جتنا بھی وقت گزرا، وہ کُل ملا کر ذیلی ادارہ لاہور کا بہترین وقت تھا۔ 2012 میں ان کی ریٹائرمنٹ ہو گئی اور میں ایک بے لوث محبت کرنے والے سینئر سے محروم ہو گیا۔

جونیئر بٹ صاحب:

کیا بات ہے جناب محمد جونیئر بٹ صاحب کی۔ درمیانہ قد، دھیما مزاج، آنکھیں چھوٹی لیکن بھرپور چمک لیے ہوئے اور اس چمک میں عقل، فہم و فراست خوب کُھلی ہوئی۔ میری ان سے پہلی باقاعدہ ملاقات مرزا نبیل امان کے گھر سمن آباد میں ہوئی۔ وہاں پہ ہم نے اکٹھے محکمہ میں تحریری امتحان کی تیاری کی اور بعد

میں کامیابی بھی حاصل کی۔ چونکہ یونی ورسٹی میں جونئیر بٹ صاحب مجھ سے سینئر تھے اس لیے ڈیپارٹمنٹ میں ملاقات کم کم ہوتی تھی۔ بٹ صاحب ایامِ طالب علمی میں انتہائی نفیس اور جاری فیشن والے ملبوسات استعمال کرنے کے عادی تھے۔ میں نے بٹ صاحب کو خاص لاہوری شہزادے کے رُوپ میں بارہا دیکھا۔ بہترن دو گھوڑا بوسکی کا چم چم کرتا کُرتہ، لٹھے کی شلوار جس کے پائنچے گلابی رنگ کی ڈوری سے پروئے ہوتے، پاؤں میں بہترین تلّےِ والی جوتی اور گلے میں سونے کی چین۔ منہ میں کبھی کبھار قوام والا پان اور سواری ہنڈا70، جو اس زمانے کی شاہانہ سواری سمجھتی جاتی تھی۔

بٹ صاحب کو سفاری سوٹ میں بھی بارہاملبوس دیکھا ہوا ہے۔ ایک زمانہ تک جب باقاعدہ نوکری سے مبرّا تھے، تو بٹ صاحب نے کچہری میں فوٹو سٹیٹ مشین کے لیے ایک جگہ کرائے پر لی اور ایک ملازم بھی رکھا۔ بعد میں جب امریکہ کا ویزہ لگ گیا تو یہ فوٹو سٹیٹ مشین والا کاروبار لپیٹ دیا۔

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ جناب بٹ صاحب سی ایس ایس کے کامیاب امیدوار ہیں، گو پوزیشن کافی نیچے تھی لیکن سی ایس ایس زدہ تو ہیں۔ غالباً سی ایس ایس کے امتحان ہی کی وجہ ہے کہ ان کا اسلامی علم چاہے تاریخ ہو یا عقیدہ، بہت مضبوط اور بغیر شک و شبہ کے ہے۔ کبھی مذہبی بحث و مباحثہ میں حصہ لیا ورنہ اکثر در گذر ہی کرتے۔ اور دوسرے احسانات کے علاوہ بٹ صاحب کا مجھ پر ایک عظیم احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے مجھے ایک دفعہ کہا کہ بندہ جو مرضی کہے یا کرے،

لیکن اس کا عقیدہ درست ہونا چاہیے۔ یہ بات مجھے خوب سٹرائیک کی اور میں نے اپنے آپ کو سیدھا کرنے کی بہت حد کوشش کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری موجودہ مذہبی کیفیت کا تعلق جونیئر بٹ صاحب کی اس بات کا اثر بھی ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں جونیئر بٹ صاحب سے زیادہ حاضر جواب خاص طور پر بذلہ سنجی میں کم ہی دیکھا ہے۔ بڑی سے بڑی سخت بات اور وہ بھی بڑے سینئر افسر کی کہی ہوئی جمیل بٹ صاحب جس کمال ہوشیاری اور الفاظ کے چناؤ میں مہارت کے ساتھ ایسا جواب دیتے کہ ساری محفل کے چہرے پر تبسم پھیل جاتا اور تناؤ کی کیفیت خوش مزاجی میں بدل جاتی۔ چند ایک واقعات ایسے ہیں جن کا یہاں ذکر نہ کیا جائے تو نااِنصافی ہو گی، مثلاً:

میں شروع شروع میں کافی غیر سنجیدہ گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ زیادہ سوشل ہونے کی وجہ سے زبان اور ہاتھ کا بے جا استعمال کرتا تھا۔ قہقہے لگاتے وقت پاس بیٹھے شخص کی ران پر زور سے ہاتھ مار دینا یا اس کی کمر کو ہلانا اور خالص لاہوری زبان کا استعمال کرنا عام تھا۔ بٹ صاحب چونکہ خالص لاہوری بیک گراؤنڈ کے حامل ہیں (کرشن نگر لاہور) اس لیے میں نے بھی عادت سے مجبور ہو کر بٹ صاحب کو ذرا زیادہ لبرٹی کے ساتھ ڈیل کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً جب بھی انھیں بلانا تو کہنا، او بٹ بہادر یا او بٹ جی، یا زیادہ اختصار کے ساتھ صرف بٹ اوئے۔ جناب جونیئر بٹ صاحب میری اس عادت کی وجہ سے سخت نالاں رہنے لگے۔ شروع شروع میں تو میری آواز کا جواب دیتے لیکن بعد میں سنی ان سنی کرنے لگے۔ مجھے کہتے، اوئے تمیز

سے بلایا کرو۔ یہ کوئی لاہور کی گلی یا محلہ نہیں ہے۔ یا تو میرا نام لیا کرو یا بہتر انداز میں پکارا کرو۔ میں سمجھ گیا کہ بٹ صاحب کو خالص لاہوری انداز میں بلایا جانا پسند نہیں ہے۔ میں بھی باز نہ آیا اور شرارت کے انداز میں اوئے بٹ صاحب، اوئے بٹ اے، تکرار کرتا رہا۔ بعض اوقات بٹ صاحب بڑے سینئر افسران جیسے راشد صاحب، ظہیر مرحوم، مسعود صاحب، انعام مرحوم صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوتے یا محوِ گفتگو ہوتے اور میں آواز دیتا تو بالکل سنی ان سنی کر دیتے بلکہ میری طرف دیکھنا تک گوارانہ کرتے۔

اب نوبت یہاں تک آگئی کہ بٹ صاحب نے عام روٹین میں بھی مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ میں نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا لیکن ایک دن ہمارا دونوں کا ٹرانسفر لیٹر آگیا۔ یہ ٹرانسفر ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ کے لیے تھی، میں اس کیمپ میں جانا چاہتا تھا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں اس قدر خوش تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ میں پہلے ایکسپلوریشن میں ہی کام کرتا تھا، اسلیے میری خواہش تھی کہ میں ایکسپلوریشن میں ہی کام کروں۔ میں خوشی خوشی لیٹر لے کر بٹ صاحب کو تلاش کرتا ہوا کیمپ کے آفیسرز کامن روم میں گیا۔ وہاں پر بٹ صاحب کو سینئر افسران کے ساتھ بیٹھا ہوا پایا۔ یک لخت اسی بے قراری اور لاپرواہی سے او بٹ صاحب اے کی آواز لگانا چاہی لیکن ہونٹ سی لیے کیونکہ اس طرح کی آواز سن کر بٹ صاحب نے بھلا کہاں آنا تھا۔ انھوں نے تو مجھے دیکھنا تک نہ تھا۔ لٰہذا سوچ سمجھ کر میں نے ہاتھ نماز والی حالت کی طرح باندھے اور نہایت شستہ اردو میں مخاطب ہوا:

جناب بٹ صاحب۔ ابھی اتنا ہی جملہ منہ سے نکلا تھا کہ بٹ صاحب کو جیسے کرنٹ لگا ہو بالکل 90 کے زاویے سے میری طرف دیکھا۔ اپنی جگہ سے اُٹھے اور آ کر میرا بازو پکڑ لیا اور میری نبض دیکھنے لگے۔ بولے، قریشی تُو ٹھیک تو ہے، تجھے کوئی ملیریا یا بخار وغیرہ تو نہیں آیا۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا! تجھے ایسا کیا ہوا کہ تو تمیز سے بات کر رہا ہے۔ بٹ صاحب کا ردعمل کوئی ایسا تھا کہ کوئی اور ہوتا تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی نئے لیٹر سے آگاہ کیا اور تیاری کا کہہ کر پلٹ آیا۔

اسی طرح ایک دن غالباً عید کی چھٹی کا معاملہ تھا۔ کیمپ سے عید کی چھٹی کے سلسلے میں آفیسر ویگن 2 بجے دپہر کو ڈی جی خان کے لیے چلنا تھی اور جناب یعقوب صاحب کا حکم تھا کہ ویگن دو بجے دوپہر کو ہی چلے گی۔ چھٹی کا سماں اور وہ بھی عید کے لیے، آخری ویگن میں 10 یا 12 آفیسر تھے جنھوں نے روانہ ہونا تھا۔ ان افسران میں جناب مسعود صاحب اور ظہیر صاحب مرحوم بھی تھے۔ ہم دونوں جونیئر افسروں کے علاوہ یونس عمر ملک اعجاز عبدالرحمٰن رفیق وغیرہ بھی تھے۔ ہم سب نے چھٹی کی خوشی میں ظہیر مرحوم سے درخواست کی کہ سر ڈی جی خان سے لاہور کے لیے بس وغیرہ میں جگہ ملنا مشکل ہو گا اس لیے آپ یعقوب صاحب سے کہہ کر ویگن 2 بجے کی بجائے 12 بجے روانہ کرنے کی اجازت دلا دیں۔ چونکہ انھوں نے بھی ڈی جی خان سے ملتان جانا تھا اس لیے وہ مان گئے اور جناب یعقوب سے ٹیلی فون پہ جازت مانگی لیکن یعقوب مرحوم نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ہم لوگ تو کسی حد تک اس

انکار کو برداشت کر گئے لیکن مرحوم ظہیر صاحب نے کچھ زیادہ ہی دل کو لگا لیا اور اپنا ردعمل کڑوی کسیلی باتوں سے دیتے رہے۔ اسی اثنا میں مسعود صاحب تشریف لائے اور ہم سب کو کہا کہ ویگن میں بیٹھیں، میری بات ہو گئی ہے۔ ہم ڈی جی خان کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ سر یہ کیسے ممکن ہوا، کیونکہ ظہیر صاحب کو تو انکار ہو چکا تھا۔ بس ہر کسی نے اپنا اپنا بیگ تھاما اور ویگن میں بیٹھ گیا۔ چنانچہ گاڑی چل پڑی۔ جب پہلی چیک پوسٹ گزری تو ہم جونیئر آفیسرز نے مسعود صاحب کی خوشامد شروع کر دی۔ سر آپ نے بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے کیونکہ ظہیر صاحب تو ناکام ہو گئے تھے، جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق حقِ خوشامد بجا لا رہا تھا اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی رہا تھا کہ لوگوں کے ردعمل اور واہ واہ کی آوازوں سے اپنی کہی ہوئی اور کی ہوئی خوشامد کے معیار اور بلندی کو ماپے۔ اسی اثنا میں جو تاریخی اور جسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چیمپئن جملہ تھا، وہ جناب جونیئر بٹ صاحب کا تھا، جو کچھ یوں تھا: 'سر آپ جیسا بندہ تو ہند سندھ میں پیدا نہیں ہوا۔' اس جملے نے باقی سارے جملے غائب کر دیے اور آدھا گھنٹہ تک لوگ قہقہے لگاتے رہے۔ جناب ظہیر صاحب جو کافی دیر سے خاموش تھے، وہ بھی اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ نارمل ہوئے۔

اسی طرح ایک دن جونیئر بٹ صاحب کو یعقوب صاحب کے دفتر سے ایک شوکاز جاری ہوا جس میں بٹ صاحب پر الزام لگایا گیا کہ آپ رات کی شفٹ میں اکثر سوئے ہوئے پائے جاتے ہیں، جس سے کام کا ہرج ہوتا ہے۔ اور آپ اس الزام کا

جلد از جلد جواب دیں وغیرہ وغیرہ۔ جونیئر بٹ صاحب یہ نوٹس لے کر بہ نفسِ نفیس یعقوب صاحب کے دفتر گئے اور اجازت کے بعد ملاقات کرنے کے لیے یعقوب صاحب مرحوم کے سامنے بیٹھ گئے۔ ہاں جی بٹ صاحب کیسے آنا ہوا؟ یعقوب صاحب مرحوم نے دریافت کیا۔ جونیئر بٹ صاحب نے وہ شوکاز سامنے رکھ دیا۔ یعقوب صاحب نے پڑھا اور کہا، ہاں تو آپ اس کا جواب دیں۔ بٹ صاحب بولے، سر جواب تو میں دوں گا لیکن اس شوکاز میں ایک بہت بڑی تکنیکی خامی ہے۔ وہ یہ کہ اس کے مطابق میں رات کی شفٹ میں سو جاتا ہوں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کئی سال ہو گئے ہیں میں رات کو سو ہی نہیں سکتا، کیونکہ مجھے نیند کا مسئلہ ہے۔ میں دن کو سونے کا عادی ہوں۔ ہاں اگر دن والی شفٹ میں سویا ہوا پایا جاؤں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن رات کو قطعاً مجھے نیند نہیں آتی۔ یعقوب صاحب کبھی جونیئر بٹ صاحب کو دیکھتے کبھی شوکاز نوٹس کو۔ خیر تھوڑی دیر بعد اپنے پی اے کو بلایا اور شوکاز میں کچھ لکھ کر اسے فائل کرنے کے لیے کہا۔ اور یوں وہ شوکاز نوٹس واپس ہوا۔

ڈی جی خان میرا اور جونیئر بٹ صاحب کا گھر ساتھ ساتھ تھا۔ ہم دونوں کی فیملیز ہمارے ساتھ ڈی جی خان میں آ گئی تھیں۔ بٹ صاحب کے بچے عمر، فاطمہ اور حیدر ڈی جی خان میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ ماشاء اللہ سب بچے بہت خوبصورت اور گول مٹول تھے۔ فاطمہ تو اتنی پیاری گوری چِٹی ہوتی تھی کہ خواجہ صاحب کی فیملی نے اس کا نام برائلر رکھا ہوا تھا۔ ایک دن بے چاری کو نظر لگ گئی، ہوا یوں کہ میں ایکسپلوریشن آفس میں بیٹھا تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اُٹھایا تو

دوسری طرف میری اہلیہ گھبرائی ہوئی بات کر رہی تھی کہ جلدی گھر آئیں، فاطمہ کو چوٹ لگ گئی ہے اور جونیئر بٹ صاحب فیلڈ کیمپ میں ہیں۔ میں فوراً اُٹھا اور گھر کو بھاگا۔ وہاں جاکر دیکھا تو بھابھی نے فاطمہ کو اُٹھایا ہوا تھا اور فاطمہ کے سر میں چائے کی پیالی کا ٹکرا چاقو کی مانند کچھ اس طرح گھسا ہوا تھا کہ میں بھی گھبرا گیا۔۔ اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اس چاقو کی طرح کھُبے ہوئے کپ کے ٹکڑے کو ہاتھ لگاؤں۔ میں فوراً بھابھی کو اور فاطمہ کو ہسپتال لے گیا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب ڈیوٹی پر تھے۔ ان کو دکھایا تو انھوں نے فوراًوہ نوکدار ٹکڑا نکال دیا اور خون ایک فوّارے کی طرح جاری ہوا۔ جلدی سے اس پر سپرٹ بھگوئی روئی اا ور پٹی رکھی اور بغیر سُن کیے زخم کو ٹانکے لگانے لگے۔ یہاں پر مجھے ڈاکٹر صاحب کی اس غیر پیشہ ورانہ حرکت پر بہت غصہ آیا اور میں نے اونچی آواز میں احتجاج کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی ان کی رپورٹ کرنے کی دھمکی بھی دی۔ بہرحال زخم سُن کرنے والا انجکشن لگا کر فاطمہ کے ماتھے کی ایک طرف ٹانکے لگائے جو کئی سال تک نشان کی صورت میں فاطمہ کے ماتھے پر موجود رہے۔

باب چہارم

وطن عزیز اور انمول لوگ

دوران ملازمت ڈیلی ویج اور ریگولر سروس کے کل ملا کر تقریباً ۳۵ سال تک وطن عزیز کو دیکھنے کا اور وطن عزیز میں بسنے والے اپنے پاکستانی بھائیوں کے ساتھ رہنے کا بہت نادر موقعہ میسر آیا۔ اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں کچھ اختصار کے ساتھ ان دونوں معاملات کا ذکر خیر تو ہوا ہے لیکن یقین جانیئے ایک تشنگیِ دل میں مسلسل چھیڑ خانی کرتی ہے کہ شاید میں اس معاملہ میں کافی سے زیادہ کنجوسی اور بخیلی کا مرتکب ہوا ہوں۔ جہاں اور معاملات میں اللہ تبارک تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں وہاں اس بات کا تو بے حد قرار واقعی شکر ہے کہ سیلانی طبیعت کو راضی برراضی کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے مجھ ناچیز پر خاص کرم کیا اور سیر سپاٹے سے مزین روز گار عطا کیا۔ وطن عزیز کے شمالی اور شمال مغربی علاقہ کو خوبصورت محل و قوع۔ قدرتی نظاروں جنت دل پذیر مقامات خوشبودار پھل میوے اور ان گنت نعمتوں سے سر فراز ہونے کی وجہ سے ضرب المثل کے درجات تو عطا ہوئے ہی ہیں لیکن ساتھ ساتھ پاکستان کے وسطی جنوب اور جنوبی حصہ کو جہاں سخت گرمی۔ سخت موسم بے

آب و گیا زمین اور دور دراز مقامات ہونے کا درجہ ملا ہوا ہے۔ وہاں بھی قدرت نے اپنی کاری گری سے ایسے جنت نظیر مقامات کو وجود دیا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی کن فیکون اور اس جیسی لا محدود طاقتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ڈی جی خان اور راجن پور جیسے علاقوں میں آفِ بند فورٹ منرو اور ماڑی جیسے مقامات جو سلیمان رینج میں وقوع پذیر ہیں اور جہاں کی آب و ہوا خوبصورتی، باغات پھلوں سے لدے پھدے درخت جھرنے مشہور صحت افزا مقامات مری یا لوئر ٹوپہ سے کسی بھی صورت میں کم نہیں۔ اسی طرح خوشاب کے ساتھ واقع سکیسر ٹاپ اگر آپ جائیں تو ویسے ہی دلفریب نظارے دیکھیں جو سوات جیسے پُر فضا مقام پر نظر آتے ہیں۔

ایک بات جو بڑی باریک بینی اور مسلسل مشاہدہ کی مرہون منت ہے وہ یہ کہ سلیمان رینج کی Foot Hills اور ان سے متصل اوپر والا علاقہ کل ملا کر چار یا پانچ کلو میٹر چوڑا اور دو سو کلو میٹر سے زائد لمبائی میں موجود ہے سارے کا سارا نہایت خوبصورت دل نشین، قدرتی کارگذاری سے مزین اور رنگ برنگے درختوں اور چٹانوں سے بھرپور ہے۔ جگہ جگہ اتنی پر سکون آرام دہ اور دل کش وادیاں ہیں کہ انسان اِن میں محو ہو جائے۔ ذرا برابر نہیں لگتا کہ یہاں سے بیس یا تیس کلو میٹر نیچے ڈیرہ غازی خان، تونسہ یا راجن پور جیسے گرم، حبس زدہ اور نا قابل برداشت رہائش والے شہر ہیں (خصوصاً گرمیوں میں) اللہ تعالیٰ نے وطن عزیز کے چپہ چپہ کو خاص طور پر پہاڑی علاقہ کو بے حد حسین بنایا ہے۔

ایک دفعہ ارضیاتی سروے کے دوران تختِ سلیمان بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ تخت سلیمان کافی اونچائی پر واقع ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار

فٹ ہے۔ درحقیقت یہ ایک ٹیرس ہے اور سلیمان رینج میں واقع ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اِس کو تختِ سلیمان کے نام سے مشہور کیا ہوا ہے یہ علاقہ اگر ٹورزِم پوائنٹ آف ویو سے تیار کیا جائے تو دوسرا فورٹ منرو بن سکتا ہے۔

اور اسی طرح کرک تخت نصرتی اور سراج خیل جیسے علاقوں میں قیام پذیر قدرت اپنی خوبصورت رعنائیوں کی وجہ سے آپ کو حیرانگی میں مبتلا کر دیتی ہے ایک دفعہ پیدل ارضیاتی سروے کے دوران صابر آباد گاؤں کے نزدیک میں اور میری ٹیم راستہ بھول گئے اور ایک بڑی پہاڑی دراڑ جو بظاہر باریک اور تنگ سی خشک ندی لگ رہی تھی اُس میں گھس گئے۔ سروے کے دوران دھیان ہی نہ رہا کہ گذرگاہ تو مشکل ہے لیکن باقاعدہ چالو راستہ نہیں ہے۔ بہرحال آہستہ آہستہ سروے کرتے کرتے ڈھلوان سے نیچے اترتے رہے آدھ گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد اچانک سامنے سے ایک دِل کش وادی اور اس میں موجود ندی کی شکل نظر آئی جس میں پانی بھی بہہ رہا تھا اور کچھ جانور بشمول گائے، بیل، بھیڑ بکریاں خوراک کی دستیابی سے سیر یاب ہو رہے تھے۔ حیرانگی کی انتہا ہو رہی تھی کہ بظاہر اُوپر سے تو یہ منظر نظروں سے اوجھل تھا۔ لیکن جیسے ہی تقریباً 100 فٹ کی گہرائی میں اُترے تو دیکھا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اتنا خوبصورت علاقہ تیار کیا ہوا تھا۔ ساری تھکاوٹ اور بھوک پیاس یکدم غائب جسم میں ایک خاص ٹھنڈی میٹھی فرحت والے احساسات اُمڈ آئے۔ تھوڑے فاصلے پر ہی تین چار کچے گھر دیکھے۔ قریب گئے اور مقامی لوگوں کی مہمان نوازی سے خوب لطف اندوز ہوئے۔

اسی ڈسٹرکٹ کرک میں ایک پہاڑ ہے جس میں مٹھا خیل، کمان گڑھ، روشنائی

کمان گڑھ اور رتی کھوئی جیسے مقامات ہیں۔ انتہائی خوبصورت لینڈ سائیٹ اور ٹوپو گرافی گھنے درختوں کے جھنڈ، میٹھے پانی کے چشمے یہاں رواں دواں دیکھے، اس پہاڑ کی بلندی بمشکل ۳ ہزار فٹ ہے لیکن ایک دن شاید دسمبر کا مہینہ تھا میں اور محمود صاحب کمان گڑھ میں کام کر رہے تھے جب ہر طرف پھول جن کا رنگ سفید تر تھا اُڑنا شروع ہو گئے اور ساتھ ہی ہمارے کان سخت سردی کی وجہ سے سرخ ہو گئے پہلے پہل تو سمجھ نہ آئی کہ یکا یک یہ پھول کہاں سے آرہے ہیں لیکن جب وہ چہرے پر محسوس ہونا شروع ہوئے تو پھر احساس ہوا کہ یہ تو برف باری کا عمل ہے جو اتنی کم اُونچائی پر بھی ہو رہا ہے حالانکہ پاکستان کی سنو لائن اوسطاً ساڑھے چھ ہزار فٹ سے سات ہزار فٹ کی بلندی تک ہے۔ بعد میں مقامی لوگوں کی زبانی علم ہوا کہ برف باری کا یہ عمل ڈسٹرکٹ کرک میں پچاس سال کے بعد ہو رہا ہے (یعنی یہاں پر برفباری پہلے بھی ہوتی رہی ہے) کرک کے اِسی پہاڑ پر ارضیاتی سروے کے دوران اس کی ٹاپ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے وقت تو جسم گرم اور گرمی کی وجہ سے کافی پژمُردگی کا احساس رہا لیکن جونہی ٹاپ پر پہنچے تو ٹھنڈی فرحت بخش ہوا اور سرسبز لینڈ سائیٹ نے استقبال کیا۔ یقین جانیے ساری تھکاوٹ اور جاتی رہی اور طبیعت ایک دم سے حشاش بشاش ہو گئی۔ بانڈہ داؤد شاہ کرک کے ساتھ ہی ہے وہاں سے ٹیری ٹوئی کی طرف جائیں تو انتہائی دل کش مناظر ہیں اسی طرح بہادر خیل کا علاقہ اور نری پانوس کسی طور پر بھی دلکش اور صحت افزا علاقوں سے کم نہیں گرگری کے علاقہ کے پاس ہی میاں جی خیل اور آگے ہنگو کا علاقہ اسی طرح کوھاٹ سے اوپر پاڑہ چنار کا علاقہ یہ سب انتہائی خوبصورت اور صحت افزا مقامات ہیں۔

کوئلہ کے سروے کے دوران مکڑ وال کا علاقہ جو ضلع میانوالی میں ہے وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ مکڑ وال کول مائنز شمال کی جانب کالا باغ کے ساتھ متصل ہیں اور ایک مخصوص دائرہ بنا کر تقریباً ۲۵ کلو میٹر کی Strire لمبائی میں جنوب کی طرف تک وقوع پذیر ہیں۔ معاملات کچھ ایسے تھے کہ کل ۴۵ کے قریب مائنز میں سے دس یا بارہ مائنز کا وزٹ کرنا تھا اور ان تمام مائنز جو کہ ایک خاص فاصلہ میں موجود ہیں ان کو اندر سے دیکھنا اور ان کے نمونہ جات بھی اکٹھے کرنے تھے۔ اس عمل کے دوران اتنی خوبصورت وادیاں دیکھنے کو ملیں کہ بعض اوقات اپنا اصل کام بھول جاتے تھے۔ اور ان وادیوں میں موجود ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشموں کے پاس بیٹھ کر قدرت کی راعنائیوں کو نزدیک سے دیکھتے رہتے۔

اسی طرح کالا باغ کا علاقہ اور اُس کے اُوپر تبی سر ساتھ ہی شکر درہ اور شکر درہ سے مغرب کی طرف کا راستہ جو صابر آباد تک جاتا ہے۔ انتہائی خوبصورت ٹوپوگرافی قدرتی مناظر اور قدرتی نعمتوں سے مزین ہے۔

اب اگر وطن عزیز کے مزید جنوبی علاقے خاص طور پر روجہان اور سندھ کے پہاڑی علاقے کر تھار رینج کا ذکر نہ کیا جائے تو بے انصافی ہو گی۔ کر تھار رینج صوبہ سندھ کو صوبہ بلوچستان سے جدا کرتی ہے۔ میں چونکہ اس رینج کے مغربی حصہ میں جانے سے محروم رہا لیکن اس کا مشرقی حصہ جہاں جہاں ارضیاتی سروے کرنے کا موقع ملا خاص طور پر واھی پاندی اور اس سے متصل ککرانی، گاجی کمب اور مزید شمال کی طرف سوری رند ان کے ساتھ جڑی وادیاں سب کی سب حیران کن حد تک خوبصورت اور دل کشا۔ ایک دفعہ کار سروے کے دوران ان وادیوں کے اندر واقع

مغرب کی جانب جانے کا اتفاق ہوا تو ان کو دیکھ کر بالکل احساس جاتا رہا کہ ہم واھی پاندی جیسے اُجار اور تپش زدہ علاقہ کے نزدیک ہیں۔

وطن عزیز کا ایک خطہ ایسا بھی ہے جہاں آپ کو گلگت بلتستان جیسی سردی اور جنوبی علاقہ میں گرمی جو کہ مخصوص مہینوں میں سخت ناقابل برداشت ہوتی ہے نہیں ملے گی۔ میرا مطلب خطہ پوٹھوار سے ہے سالٹ رینج کا پہاڑی علاقہ اور اس سے متصل پہاڑی چوٹیاں سب کی سب انتہائی فرحت بخش اور دل پذیر موسم کی پیامبر ہیں یہاں پر پیل پدرار منارہ، کلر کہار جیسے دل کشا مناظر سے بھرپور علاقے ہیں کہ دل کرتا ہے یہیں رہ جائیں۔ کلر کہار جھیل اور اس کے ارد گرد کا علاقہ جہاں لوگاٹ سے لدے پھدے درخت (موسم بہار میں) اور گلاب کے پھولوں کے باغات ہیں پھولوں سے گل قند اور عرقِ گلاب حاصل کیا جاتا ہے اور جو ہر سیاح خریدتا ہے ساتھ شہتوت سے لدے پھدے شہتوت کے درخت جو نہ صرف ذائقہ میں بلکہ مخصوص فرحت بخش خوشبو کے حامل ہونے کی وجہ سے مشہور ہیں بلکہ ایک خاص قسم کی منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ شام ہوتے ہی مغرب کی نماز سے ذرا پہلے چاروں طرف سے پرندے جن میں زیادہ تعداد کوّوں کی ہوتی ہے۔ وہ جھیل کلر کہار کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیتے ہیں اگر آپ کلر کہار ٹول پلازہ جو کہ چکوال کی طرف ہے اس کے ساتھ والی چٹان پر بیٹھے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی جانب سے اُڑتے آرہے ہیں اور منزل اِن تمام کی کلر کہار جھیل ہے جہاں یہ رات کو قیام کرتے ہیں اور صبح پھر اپنی اپنی منازل کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔ یہ بالکل اِسی طرح کا عمل ہے جو ہم نے

ڈھنیگن بنگلہ میں موجود آم کے درختوں پر اُمڈتے اور رات کا بسیرا کرتے سینکڑوں کی تعداد میں طوطوں کو کرتے دیکھا۔ کلر کہار جھیل کے جنوب مغربی کنارے تھوڑی بلندی پر بابا یعقوب المعروف موروں والی سرکار کا مزار ہے اس مزار کے احاطہ میں کافی تعداد میں نہایت خوبصورت جنگلی مور اٹھکیلیاں کرتے نظر آتے ہیں اور جب زیادہ مستی میں ہوتے ہیں تو یکدم مزار کے احاط سے اُڑان بھرتے ہیں اور ایک دبیز گہری چھاؤں میں بناتے ہوئے جھیل کے جنوب مشرقی حصہ میں کافی دور تک پرواز کر کے وہاں اترتے ہیں کچھ دیر وہاں مٹر گشت کر کے پھر وہیں سے اپنے پرانے ٹھکانے پر چلے جاتے ہیں۔ ایسا ہی دلکش منظر احمد بانڈہ ڈسٹرکٹ کرک میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کسی تکنیک کار سے ملنے احمد بانڈہ جانے کا اتفاق ہوا۔ انڈس ہائی وے سے مغرب کی طرف یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گاؤں ہے۔ یہاں پر کافی پڑھے لکھے لوگ ہیں اور حالات حاضرہ سے بخوبی واقف ہیں۔ جیسے ہی انڈس ہائی وے سے احمد بانڈہ والی ذیلی سڑک پر چڑھے تو باوجود سورج کی روشنی کے اور صاف مطلع کے یکدم چھاؤں سے چھاگئی کچھ لمحوں تک یوں محسوس ہوا کہ بادل آگئے ہیں اور جن کی وجہ سے سورج کی روشنی مدھم پڑگئی ہے لیکن جب درجنوں کی تعداد میں بڑے پنکھوں والے پرندے دیکھے جو ایک ساتھ ایک ہی بلندی پر اُڑ رہے تھے تو غور سے اِن پرندوں کو شناخت کرنے کے بعد پتہ چلا کہ یہ کونجیں ہیں جو یہاں پر لوگ شکار کرتے ہیں اور پھر پال لیتے ہیں۔ تھوڑی محنت کے بعد یہ ہی کونجیں یہاں رہ جاتی ہیں اور ان کی نسل میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ تھوڑی جستجو کے بعد علم ہوا کہ یہاں ایک صاحب نے اِن کا باقاعدہ فارم بنایا ہوا ہے جہاں اِن کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا

ہے۔اِسی طرح چواہ سیدن شاہ اور کٹاس کے بالائی حصہ میں گھنے جنگلات ہیں۔ اِن جنگلات میں ہرن کی بہترین اور نایاب اقسام پائی جاتی ہیں۔ پہلے پہل تو ہرن کافی بہتات میں ہوتے تھے لیکن ہرن کے شکاریوں کے اندھادھند شکار کی وجہ سے اِن کی تعداد خاصی کم ہوگئی ہے۔ اِسی جنگل میں کالا تیتر، دکھنی تیتر اور ان گنت اقسام کے پرندے بکثرت دیکھے جاتے ہیں۔

چکول کا سارا علاقہ بشمول ستوال، چواہ سیدن شاہ، بن امیر خاتون اور مشرقی کی طرف آڑا بشارت اور جنوب میں کسک جنگل انتہائی خوبصورت اور قابل دید علاقے ہیں۔اِسی خطہِ پوٹھوار میں مشہور وادی سون بھی ہے اس وادی سون کے شمال مشرقی سمت میں ایک باغ ہے جو کنہٹی باغ کے نام سے مشہور ہے ہم ارضیاتی سروے کرتے کرتے جب اِس جگہ میں پہنچے تو قدرت کے حیران کُن مظاہر میں سے کچھ مظاہر یہاں بھی دیکھے۔ اس باغ میں جون کے مہینہ میں ایک خاص قسم کے مالٹے کے درخت کی موجودگی ہے جن میں انتہائی رس دار، میٹھے اور فرحت بخش مالٹے لگے ہوتے ہیں۔نہ صرف مالٹے بلکہ اِسی باغ میں ہم لوگوں نے بادام، خوبانی اور سیب کے درخت بھی دیکھے۔ بادام، خوبانی اور سیب کی پیداوار ایک مخصوص بلندی والے اور مخصوص موسم درجہ حرارت والے علاقوں کی ہے جبکہ اِس کنہٹی باغ کی نہ تو اونچائی زیادہ ہے (زیادہ سے زیادہ 2500یا3000 فٹ ہوگی) اور نہ ہی یہاں کا درجہ حرارت بھی ایسے پھلوں والے درخت یا اقسام کی افزائش سے مطابقت رکھتا ہے لیکن پھر بھی یہ حیران کن مظاہر نظر آتے ہیں۔

وطن عزیز میں بسنے والے پاکستانی بھائیوں خاص طور پر ان پہاڑی علاقوں میں

برسوں سے رہائش پذیر لوگوں کے بارے میں ان کی عادات و فضائل بودوباش اور مہمان نوازی کا ذکر خیر انتہائی ضروری ہے۔ کچھ کا ذکر تو میں نے اندر کے صفحات میں کیا بھی ہے لیکن کچھ ایسے واقعات ہیں جو یقیناً پڑھنے والوں کو حیرت میں مبتلا کر دیں گے۔ مثلاً ایک واقعہ ہے جو کرک ڈویژن کا ہے میں اور محمود صاحب ایک دفعہ ارضیاتی سروے کرتے ہوئے اپنے ٹارگٹ سے بھی کافی آگے نکل آئے۔ صورت احوال ایسی بنی کہ پانی کی بوتل بھی خالی ہو گی اور اس دن کھانا بھی ساتھ نہ لا سکے تھے۔ سروے کرتے ہوئے جب کھانے پینے کی اشیاء نہ رہیں اور تھکاوٹ بھی غلبہ پانے لگی تو پھر ایک جائے پناہ کی تلاش شروع ہو گئی جہاں کچھ دیر استراحت کے لمحات گزارنے کے علاوہ چائے پانی جیسی نعمت کا بندوبست بھی ہو۔ میں اور محمود صاحب ابھی نشیب میں ہی تھے کہ اوپر پہاڑ کے دامن میں ایک قطعہ سبز نظر آیا۔ ہمت جمع کر کے ہم دونوں اس قطعہ کی طرف روانہ ہوئے یہ ذرا اُونچائی میں تھا اس کے لیے کافی محنت سے چڑھائی پر چڑھنا شروع کیا۔ کافی تگ و دود کے بعد جب دہاں پہنچے تو وہاں ایک بیٹھک بنی ہوئی تھی اندر آٹھ دس چار پائیاں بچھی تھیں اور ہر چارپائی کے سرہانے ایک ایک گاؤ تکیہ انتہائی نفاست کے ساتھ سجا تھا۔

اس بیٹھک کے ایک کونے میں دو عدد ٹھنڈے اور صاف پانی کے مٹکے بھی موجود تھے۔ ساتھ ہی گلاس اور پانی انڈیلنے والا مگہ بھی تھا۔ یار لوگوں نے سب سے پہلے سیر ہو کر پانی پیا اور بچھی چارپائیوں پر بے سدھ ہو کر لیٹ گئے۔ ارادہ یہی تھا کہ پندرہ بیس منٹ کے بعد چونکہ پانی پی لیا ہے اس لیے تھوڑا ستا کر دوبارہ اپنے راستہ پر چل پڑیں گے کہ ایک نہایت خوبصورت جوان جس کی عمر تقریباً ۲۲ سال ہو گی

سفید لباس میں ملبوس بیٹھک میں داخل ہوا اور انتہائی خندہ پیشانی سے ملا۔ اُس جوان نے کوئی سوال نہیں کیا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جانا ہے؟ بس اتنا کہا آپ تھوڑا آرام کریں میں ابھی آتا ہوں یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پانی کی پیاس تو بجھ گئی تھی لیکن اب بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ خیال یہی تھا کہ یہ جوان چائے اور بسکٹ لے کر آئے گا۔ لیکن جب وہ آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں روٹیوں سے بھرا ہوا چھابہ (توشہ دان) اور دوسرے ہاتھ میں ٹماٹر اور ہری مرچ سے بنا سالن تھا میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ لذیز کھانا کبھی نہیں کھایا۔ ٹماٹر اور ہری مرچ کا سالن ساتھ بڑی بڑی دیسی گندم کی گرم گرم روٹیاں خوب سیر ہو کر کھایا۔ اب بیٹھک کا ٹھنڈا ماحول جس کے چاروں طرف 4x4 فٹ سائز کی کھڑکیاں اور اِن کھڑکیوں سے ٹھنڈی ہوا کی آمد ماحول کو بے حد خواب ناک بنا رہی تھی۔ ساتھ ہی جب پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہو تو غنودگی بھی چھا جاتی ہے۔ ابھی قیلولہ کی ابتدائی سٹیج میں تھے کہ وہ جوان گرم قہوہ کی پیالیاں لے کر آگیا۔ قہوہ بھی نوش کیا اور اس سارے عمل کے دوران وہ جوان ہمارے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا اُس کے طرزِ عمل سے بالکل محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی قسم کی ایمرجنسی یا پریشانی میں ہے۔ جب قہوہ ختم ہوا تو وہ جوان اُٹھا اور اُس نے ایک ایسی بات کہی کہ ہم دونوں کی زبان گنگ اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کی مہمان نوازی اور سلوک سے تو ہم دونوں پہلے ہی متاثر تھے لیکن جو بات اُس نے کی اس بات نے ہمیں شرمندہ ہی کر دیا۔ وہ کچھ یوں تھی کہ ابھی آپ لوگ یہیں رکیں اور آرام کریں۔ میرا ایک جوان کزن صبح انتقال کر گیا ہے اور اس کا جنازہ بالکل تیار ہے۔ جب آپ لوگ اس بیٹھک

میں داخل ہو رہے تھے تو میں نے دیکھ لیا تھا اس لئے اس کزن کی تدفین تھوڑی دیر کے لیے معطل کر دی کہ پہلے مہمانوں کی خاطر کی جائے لہٰذا میں اُس کزن کی تدفین کے بعد حاضر ہو جاؤں گا۔ تب تک آپ یہیں رکیں۔ یہ سننا تھا کہ میرے اور محمود صاحب کے پاؤں سے زمین نکل گئی اور ہم دونوں کو چپ سے لگ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے بہت مشکل سے اُس جوان سے اجازت لی اور بیٹھک سے باہر آ گئے اور سوچ میں پڑ گئے کہ یہ کیسے لوگ ہیں تیار جنازہ چھوڑ کر مہمان نوازی کے عمل کو پورا کیا اور ہمیں احساس تک نہ ہونے دیا۔

یقین کریں اتنی عظیم دانشان مہمان نوازی کی کوئی اور مثال میرے یا محمود صاحب کے علم میں نہیں۔ بہر حال ہم بالکل خاموشی سے وہاں سے رخصت ہوئے اور اپنی گاڑی میں بیٹھے تک نہ تو ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نہ ہی کوئی بات کی۔

اسی طرح میں اور میری ٹیم چلاس میں دریائے سندھ کے کنارے ایک پراجیکٹ کر رہے تھے۔ آپ اگر چلاس سے رائے کوٹ برج جائیں تو بائیں طرف والے پہاڑ سارے ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں ایسے لگتا ہے کہ بالکل ویران اور اُجاڑ سلسلہ کے پہاڑ ہیں اور کسی قسم کا کوئی گھر یا گھر نما چیز محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے چند ایک نمونے اکٹھے کرنا تھے تو میں نے مقامی افراد جو ماروز تھے اُن سے ذکر کیا۔ اُن لوگوں نے فوراً میری مدد کرنے کی ٹھان لی۔ غرض یہ کہ وہ مجھے پہاڑوں میں لے گئے جو شاہراہ قراقرم سے بے آب و گیا اور ویران نظر آتے ہیں لیکن جو نہی ہم لوگ ایک موڑ سے پہاڑ کے اندر گئے تو وہاں باوجود سورج کی روشنی کے ایک ٹھنڈا ٹھاڑ سایہ محسوس ہوا۔ سایہ کی وجہ تسمیہ جاننے کیلئے سر اُٹھا کر دیکھا تو انگور کی گھنی

بیل جن میں کالے رنگ کے انگوروں کے گچھے لٹکے ہوئے تھے دیکھا۔ یہ بیل پورے راستہ میں سایہ فگن تھی اب جب سنبھل کر چلنے لگے تو پاؤں میں ایک باریک سی نالی جس میں صاف و شفاف ٹھنڈا پانی بہہ رہا تھا۔ اور ساتھ میں تقریباً دائیں بائیں موجود پچاس کے قریب گھروں کے ساتھ سے اُن کی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے اپنا راستہ لے رہی تھی۔ خواب ذدہ ماحول جس کا بالکل بھی تصور سڑک سے محال تھا لیکن اندر ہی اندر ایسا جنت نذیر ماحول تھا کہ میں آج تک حیران ہوں اُن لوگوں کی بہت محنت اور قابل رشک رہائش کے منصوبوں پر، جو صرف یہاں پر ہی موقوف نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے داریل وادی اور اُس سے ملحقہ علاقوں میں بھی یہی اندازبودوباش ہے۔ بہر حال وہ مجھے پہلے پہل تو نمونہ والی جگہ لے گئے جہاں سے میں نے نمونے اکھٹے کئے بعد میں جو اُنہوں نے میری دعوت کی اور جیسا کھانا کھلایا اور جو پروٹوکول دیا۔ میں ہرگز تصور نہیں کر سکتا یہ معاشر کے الگ تھلگ لوگ ہیں۔

دوران ملازمت بارہا بیرونی ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا۔ شمال مشرقی ایشاء جنوب مشرقی ایشیاء مشرق وسطیٰ اور یورپ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان علاقوں کے ممالک نے اپنے ملک کو خوبصورت بنانے میں یا قدرتی خوبصورتی کو بحال رکھنے میں ہر ممکن کوششیں کی اور اس میں خاصے کامیاب بھی ہیں۔ لیکن یقین مانیئے۔ جو خوبصورتی۔ دیدہ زیب مناظر زرخیز زمین۔ پھل اور اُن کا ذائقہ ملک عزیز کا ہے کسی اور ملک میں نہیں پایا جاتا۔ آم کیلا سیب۔ امرود اور بے شمار دوسری اجناس دوسرے ممالک میں بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن جو ذائقہ رنگت اور خوشبو ہمارے ملک پاکستان میں پیدا ہونے والی اجناس کی ہے وہ کہیں اور نہیں۔

میں اپنے نوجوانوں کو یہ بات ضرور کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک عظیم انشان ملک عطا فرمایا ہے جہاں سارے موسم اور بے شمار نعمتیں ہیں دریا، سمندر، ریگستان فلک پوش پہاڑ ہر قسم کا وافر پھل اور زرعی اجناس اس نعمت کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ ہمیں اپنے اس ملک کی قدر میں، عزت میں اور وقار میں ہمیشہ اضافہ کرتے رہنا چاہیئے۔ اس ملک کی عظمت کا نقارہ اُس وقت زیادہ محسوس ہوتا ہے جب ہم کسی غیر ملک میں جاتے ہیں۔ اور وہاں کی پابندیوں میں جکڑ بند ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ ہمارے اس عظیم ملک کو ہمیشہ قائم دائم رکھے اور اس کی ترقی میں روز بروز اضافہ ہو۔

ریٹائرمنٹ اور الوداعی تقریب

آخر کار 15 نومبر 2019 کا وہ شاندار دن آ گیا جب میر اس محکمے اور اس محکمے کے ساتھ جُڑی ہوئی ہر کارروائی سے رخصت لینے کا وقت آ گیا۔ یہ وقت ہر ایک ملازم پر آتا ہے۔ میں نے بیسیوں سنیئر افسران کی ریٹائرمنٹ کے سلسلے میں ہونے والے ریفرینسز اور ان کے اعزازات میں تقریریں کیں۔ ان کی خوبیاں بیان کیں اور ان کے نہ ہونے سے جو کمیاں رہ جاتی ہیں، ان کا ذکر بھی کیا اور آج میں آڈیٹوریم میں مہمانوں کے لیے سجائی ہوئی تین کرسیوں کے درمیان والی کرسی پر مہمان کے طور پر بیٹھا ہوا تھا۔

جناب محمد عامر صاحب آج کے سٹیج سیکریٹری تھے۔ میری دائیں طرف جناب ارشد صاحب اور بائیں جانب خان صاحب براجمان تھے۔ سٹیج کے سامنے تقریباً ایک سو کے قریب حاضرین تھے اور کیا شانِ الٰہی ہے کہ ایسی عزت، ایسا احترام میرے

انتہائی عزیز اور محبت کرنے والے مجھ پر نچھاور کر رہے تھے۔

جناب سلطان صاحب افسر اعلیٰ ذیلی ادارہ کوہاٹ خصوصی طور پر چھُٹی لے کر میرے ریفرینس کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے اور انھوں نے میری بے حد عزت افزائی کی، جس کے لیے میں ان کا بہت ممنون ہوں۔ اسی طرح جناب خالد صاحب نے ڈائس پر آکر میرے بارے میں بہترین خیالات کا اظہار کیا۔ خاص طور پر جناب اظہر کا میرے بارے میں یہ بیان کہ اگر کوئی نیا جیالوجسٹ سنٹر میں آئے تو اسے عباس قریشی کے حوالے کر دو، تو وہ بہترین جیالوجسٹ بن جائے گا۔ میں خالد صاحب اور اظہر صاحب کا اس ایوارڈ کے لیے بہت احسان مند رہوں گا۔

اسی طرح افسر اعلیٰ ایڈمنسٹریشن اور آخر میں جناب خان صاحب نے میرے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کیا خوب کیا۔ اس کے لیے میں ان دونوں کا بہت شکر گزار ہوں۔ آخر میں سٹیج سیکریٹری نے مجھے دعوت دی اور میں نے جہاں دیگر باتیں کیں، وہیں آغاز اس بات سے کرنے سے باز نہیں آیا کہ میں نے اپنے کیریئر کا آغاز ایک ڈیلی ویجر کی حیثیت سے کیا اور اس بات پر مجھے بہت فخر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کی محنت کو رایگاں نہیں جانے دیا اور مجھے اس قادرِ مطلق نے باون روپے روزانہ اجرتی کو آج افسر برائے منصوبہ بندی کی پوسٹ سے ریٹائر کروایا۔ آپ بھی کہتے ہوں گے کہ عباس قریشی نے کیا ڈیلی ویجر ڈیلی ویجر کی رٹ لگائی ہوئی ہے تو اس سلسلے میں میرا کوئی اور منشا یا مقصد نہیں کہ اپنے آپ کو نرگسیت کا شکار ثابت کروں یا اپنی کسی کمی کو زائل کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر بات کروں۔ بات یہ ہے کہ عقلمند کہتے ہیں، تجربے کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک عمر

صرف کرنا پڑتی ہے۔ ہر قسم کا موسم اس موسم میں، کبھی خوشی کبھی غم سہنا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی اس خودنوشت میں بارہا حشرات الارض، گرمی سردی، حادثات، مافوق الفطرت اور غیر مرئی مخلوق کا ذکر کیا ہے، جو کہ واقعتاً میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ پیش آئے۔ اگر تو کوئی نرم طبیعت رکھنے والا شخص سمجھتا ہے کہ وہ پہاڑوں کی خوبصورتی، چشموں اور ٹھنڈی چھاؤں اور حسین قدرت کے نظاروں میں رہ کر اور ان میں کھو کر جیالوجی بھی سیکھ لے اور کامیابیاں بھی حاصل کر لے تو میرا ذاتی خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

میں جب سخت گرم موسم والے بے آب و گیاہ، ویران ڈی جی خان کے تقریباً کالے پتھروں سے بھرے ہوئے پہاڑوں میں کام کرتا تھا تو میں اور میرے ہم نوا اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے یا سینئر افسران سے پوچھتے کہ 'سر! ہمارا مطلوب و مقصود کیا ایسے ہی جہنم ٹائپ علاقوں میں ملتا ہے؟ کیا اس کی تلاش اور دستیابی ٹھنڈے برف پوش شمالی علاقہ جات میں نہیں؟' تو جواب ملتا کہ 'جہاں سے یہ گوہرِ مقصود ہاتھ آ رہا ہے، اسے حاصل کرتے رہو۔ اللہ مہربانی فرمائے گا۔' پھر وہ وقت آیا جب ہم سالوں گلگت بلتستان جیسے علاقوں میں اسی گوہرِ مقصود کو حاصل کرنے کے لیے قیام کرتے اور پھر جب حد سے زیادہ سردی ہو جاتی بلکہ ناقابلِ برداشت، تو پھر ڈی جی خان والے علاقے اچھے لگنے لگتے۔ انسان واقعی بے صبرا اور ناشکرا ہے۔

پہاڑ جتنے بھی سرسبز و شاداب، خوش کن، پُر بہار باغوں اور چشموں سے لبریز کیوں نہ ہوں، یہاں پر زیادہ سے زیادہ تین دن یا پانچ دن اور اگر کوئی بہت ہی سخت جان ہو تو دس دن تک رہ سکتا ہے۔ میرا ذاتی خیال اور تجربہ ہے کہ سیر سپاٹے کے

لیے آنے والے سیاح ان مندرجہ بالا دنوں سے زیادہ قیام نہیں کرسکتے۔ یہ قدرت کا اپنا نظام ہے۔ یہاں کے مقامی لوگ بہت محنت ومشقت سے اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں میدانی علاقوں کے مقابلے میں ضروریاتِ زندگی کے وسائل بے حد کم ہوتے ہیں جو غیر معمولی قیام کی وجہ سے پورا نہیں ہو پاتے۔ مثلاً گلگت میں دریائے گلگت بڑے زور و شور سے سارا سال بہتا ہے لیکن وہاں کی مقامی آبادی کے پاس پینے والے پانی کی شدید کمی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو پینے کا پانی یا گھریلو استعمال کا پانی مہنگے داموں خریدنا پڑتا ہے۔ اسی طرح گندم، آٹا، چینی، گھی وغیرہ درآمد کی جاتی ہیں۔ اکثر اوقات جب شاہراہِ ریشم بلاک ہو جاتی ہے تو ان اشیاء کی قلّت بھی ہو جاتی ہے۔ اب چونکہ حالات کچھ ٹھیک ہیں، اس لیے آلو کی فصل خوب کاشت کی جاتی ہے۔

آخر میں نوجوان نسل کے لیے پیغام چھوڑنا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی کام شروع کرنے کے لیے آپ کو ضروری نہیں کہ باقاعدہ مضبوط پلیٹ فارم ملے اور آپ کام شروع کریں، اگر مضبوط بنا بنایا پلیٹ فارم مل گیا تو بڑی خوش قسمتی ہے۔ اللہ کا خاص کرم ہے۔ لیکن اگر آپ کو باقاعدہ پلیٹ فارم نہیں ملتا یا چھوٹا پلٹ فارم اور عارضی کام ملا ہے تو کبھی بھی انکار نہ کریں۔ ایک دفعہ کام شروع کریں اور سو فیصد ایمانداری اور محنت کے ساتھ کریں۔ میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنھوں نے اپنے کیریئر کی ابتدا چھوٹے پلیٹ فارم سے شروع کی اور بہت بڑے بڑے مقام تک پہنچے۔ ان شاء اللہ آپ کی مرضی کا مقام آپ کو ملے گا۔

○ ○ ○